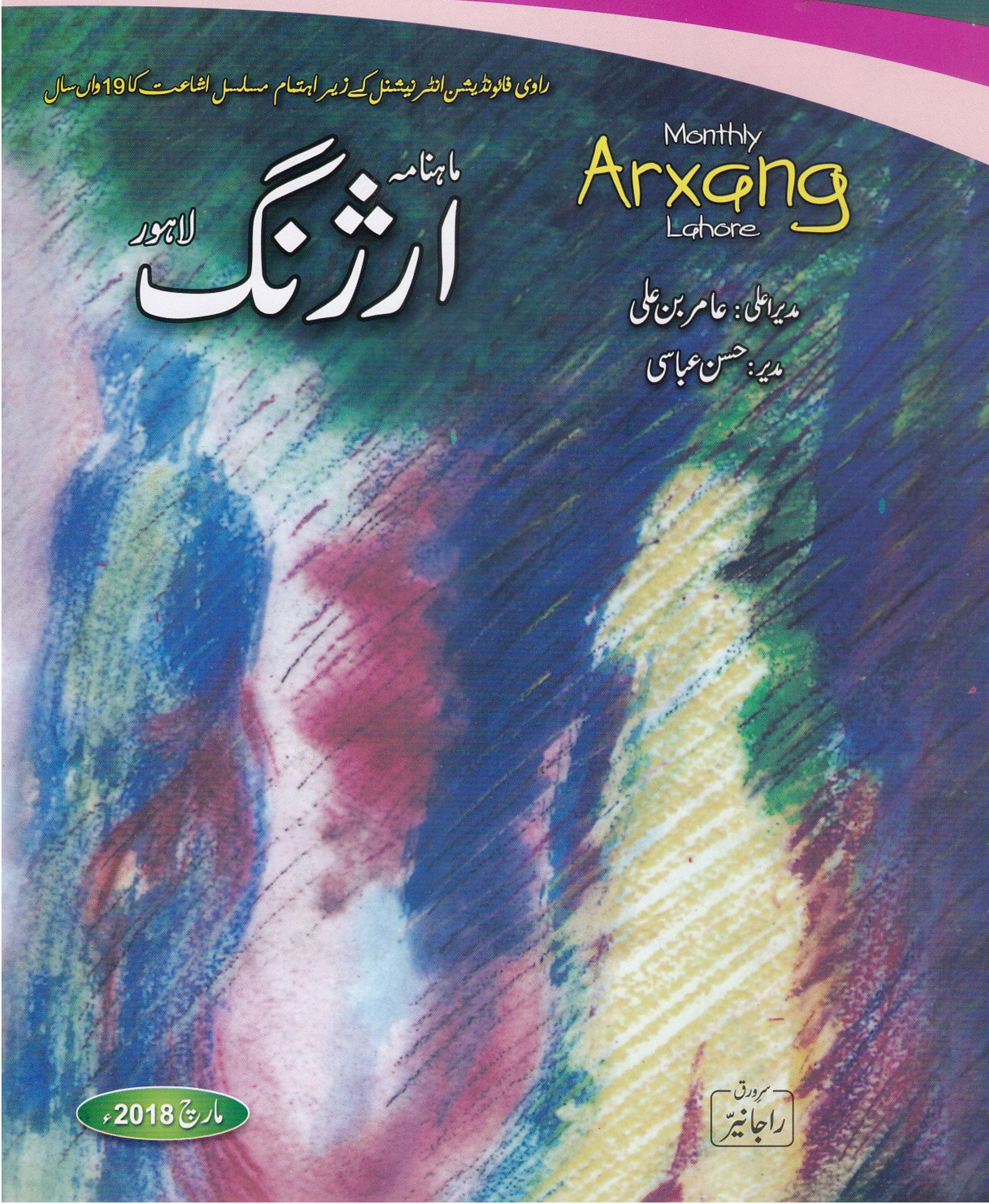

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly

Arxang

Lahore

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

مارچ 2018ء

سرورق
راجا نیرّ

نامور ادیب غلام حسین ساجد سے عامر بن علی کی گفتگو

ادب کسی نہ کسی سطح پر اپنے عہد اور سماج سے جڑا ہوتا ہے

عامر بن علی: سب سے پہلے اپنے ادبی وسوانحی پس منظر سے آگاہی دیجیے۔

غلام حسین ساجد: میرا تعلق میاں چنوں کی نواحی آبادی ''بستی کبیر ستپال'' سے ہے۔ میں ستپال ہوں جوسیال راجپوتوں کی ایک شاخ ہے اور گنجی بار کے اس حصے میں صدیوں سے آباد ہے۔ خانقاہی تاریخ سے متعلق لوگ جانتے ہیں کہ خود حضرت میاں چنوں کی نسبت اسی قبیلے سے ہے۔ یہ لوگ زمیندار اور زراعت سے متعلق ہیں اور تعلیم و تعلّم سے انہیں کبھی علاقہ نہیں رہا۔ ان کے مزاج پر قبائلی روایت کا غلبہ تھا اور ہے۔ میں مذکورہ بستی میں یکم دسمبر 1951ء کو مہر سجاول کے گھر پیدا ہوا۔ میری ماں کی خواہش اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کی تھی۔ سو میں نے نواحی گاؤں جراحی اور پکا حاجی مجید میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایم سی ہائی سکول میاں چنوں سے میٹرک، گورنمنٹ کالج ساہیوال سے انٹر، اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور سے ڈگری اور یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے پنجابی اور اُردو کیے۔ ادبی پس منظر کی حیثیت خود مکتفی ہے۔ ادبی ذوق کی بنیاد مطالعہ تھی اور رہنما ادبی کتب۔

عامر بن علی: عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

غلام حسین ساجد: عملی زندگی کا آغاز لاہور سے اپریل 1978ء میں ہوا۔ جب میں پنجاب پبلک سروس کمیشن سے ریسرچ ایسوسی ایٹ منتخب ہونے کے بعد مرکز تحقیق وترقی نصاب میں تعینات کیا گیا۔ یہاں معروف نقاد اور شاعر صدیق کلیم جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل رہے تھے، ڈائریکٹر تھے۔ میرے مشفق و مہربان رہنما ہوئے اور مجھے عالمی ادب کے مطالعے کی راہ پر لگایا۔ اس سے کئی برس پہلے میں جناب محمد سلیم الرحمٰن، نجم حسین سیّد، جناب علی عباس جلال پوری، جناب احمد ندیم قاسمی اور کئی اور معروف لکھنے والوں کے حلقہ ارادت میں داخل ہو چکا تھا۔ سو لاہور میں تعیناتی نے میرے ذوق ادب کو مہمیز کیا۔

میں مشاعرے کا آدمی نہیں اور ادب کے معاملے میں خوشامد اور رواداری سے کام لینا بھی میرے بس سے باہر ہے

عامر بن علی: ادب سے شوق کی ابتدا؟

غلام حسین ساجد: اس کے لیے کسی خاص عمر یا مدت کا تعین کرنا مشکل ہے۔ میں ابھی تیسری جماعت میں تھا کہ میرے باپ کے رسوخ کے باعث مجھے سکول میں موجود کتابوں کے مقفل صندوق کو کھلوانے کی سہولت مل گئی تھی۔ پھر شہر آنے پر آنہ لائبریریوں سے کتابیں لے کر پڑھنے اور خود خرید کر پڑھنے میں بھی کوئی دقت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میٹرک تک میں نسیم حجازی، صادق حسین سردھنوی اور رئیس احمد جعفری سے آغاز کر کے کرشن چندر، منٹو اور بیدی تک پہنچ گیا تھا۔ شاعری کا مطالعہ کالج میں آنے کے بعد آغاز کیا۔ مگر اپنا پہلا شعر غالباً میں نے تیرہ برس کی عمر میں کہا تھا اور اسے صحن کی کچی زمین پر اپنی انگلی سے نقش کیا تھا۔ کیوں کہ وہ رات تھی اور مدھم چاندنی میں بس مجھے یہی قرطاس دستیاب تھا۔

(بقیہ اندرونی صفحات پر)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 19 مارچ 2018 شمارہ نمبر 2

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس مشاورت}

محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)
محمد ادریس لاہوری (ناروے) ◉ ڈاکٹر سید ندیم حسین (ناروے) ◉ نازو کاڑوی

کمپوزنگ ● زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹوگرافر ● نعمان حسن : 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ● محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نازو کاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے
بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت ، ۲

مضامین:

○ منو بھائی...... شیشوں کا مسیحا رُخصت ہوا / عامر بن علی ، ۳
○ نگاہِ مصطفےٰ شاہدہ لطیف کی روحانی صوت/خورشید بیگ میلسوی ، ۵
○ تم محبت کا استعارہ ہو / نوید مرزا ، ۷
○ "بھولے بسرے شہر کے لیے ایک نظم" کا تجزیہ/ ڈاکٹر فرزانہ کوکب ، ۱۱
○ پھلواری / اسلام عظمی ، ۱۳
○ اذنِ حضوری / نازو کاڑوی ، ۱۵
○ قمر حجازی فکر و فن کے آئینے میں / ڈاکٹر سید قاسم جلال ، ۱۶
○ ہمہ جہت تخلیق کار...... راجا نیئر / اقرا شوکت ، ۱۷

افسانے

○ انتقام / سعدیہ بتول ، ۱۹
○ یک بوسۂ جاں / سیّد تحسین گیلانی ، ۲۲
○ سیّدہ آیت / وائے نصیبا ، ۲۴
○ میٹھا زہر / ایم آر شاہد ، ۲۵
○ جرم / اینلہ بھٹر ، ۳۱
○ لاعلاج مرض / طیبہ خان ، ۳۴

شعری گوشے:

○ محمد ادریس لاہوری، فرزانہ فرحت، شہباز نیئر، اسد عباس خان
ساجد رضا خان، ۳۷ تا ۴۱

سفر نامہ

○ کلنگ سے لنکاوی / یونس وریام ، ۴۲
○ بقیہ انٹرویو غلام حسین ساجد ، ۴۶
○ شاعری ، ۴۸

مختصر ادبی خبریں ، ۵۱

نامہ ہائے احباب ، ۵۲

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد باری تعالیٰ

خداوند تو مختارِ جہاں ہے
کرشمہ ساز تجھ جیسا کہاں ہے
ہر اک شے میں ترے آثار ظاہر
مگر پھر بھی تو پردے میں نہاں ہے
زمیں کو صحنِ گل تو نے بنایا
سروں پر لاجوردی آسماں ہے
ترے محبوبؐ کی چاہت تری چاہ
ترے قرآن کا واضح بیاں ہے
تو احد ہے تو ترا محبوب احمدؐ
کہ بھید اک "م" ہے جو درمیاں ہے
تری توحید کی تبلیغ یوں کی
سرِ شبیرؑ ہے نوکِ سناں ہے
ترے اسرار مولا تو ہی جانے
کہ تیرا معجزہ سارا جہاں ہے
ترا عاجز سا بندہ نام طاہرؔ
تری تعریف میں رطب اللساں ہے

راجا غلام اصغر طاہرؔ/خوشاب

یارب العالمین

سائبان ہے سر پر اپنے رب کی رحمت کا
لمحہ لمحہ ہے مظہر اُس کے فضل و برکت کا
اے خدا ترے در سے ایک شے کا طالب ہوں
تو مجھے مقلد رکھ شاہِ دیںؐ کی سنت کا
اور کچھ نہیں یارو اتنا جانتے ہیں ہم
وہ جو اس کا بندہ ہے بندہ ہے محبت کا
اپنی عظمتیں یارب مجھ پہ منکشف کر دے
تیری دید سے بڑھ کر کب ہے شوق جنت کا
اے ندیمؔ مجھ کو ہے ناز اس سعادت پر
نغمہ ہے مرے لب پر کبریا کی مدحت کا

ریاض ندیم نیازی/سبی

نعت رسولؐ

نور ہی نور ہیں حضورؐ مرے
جلوۂ طور ہیں حضورؐ مرے
درگزر آپؐ کی شفاعت
سب خطائیں سبھی قصور مرے
آپؐ ہی ان کو جوڑ سکتے ہیں
آئینے چور ہیں حضورؐ مرے
اُن کے نعلین چومنے والی
کاش گھر میں اُگے کھجور مرے
جب سے آقاؐ نے سرفراز کیا
عجز میں ہیں کئی غرور مرے
اُنؐ کے صدقے میں ہر خوشی پائی
غم ہوئے سارے دور دور مرے
عشق خیر البشرؐ سے ہیں منسوب
کیف سارے سبھی سرور مرے
آپؐ کے روضہ مبارک کو
لب چھوئیں گے کبھی ضرور مرے
جب سے کہتا ہوں انؐ کی نعت جلیلؔ
رحمتیں در کریں عبور مرے

احمد جلیل/اوکاڑہ

میلادِ مصطفیٰؐ کا مناؤ گلی گلی
نعت رسولِ پاک سناؤ گلی گلی
اب وقت آ گیا ہے کہ میلادِ پاک سے
سوئے ہوئے نصیب جگاؤ گلی گلی
رنج و الم مصیبتیں مٹ جائیں گی سبھی
نغمے درود و پاک کے گاؤ گلی گلی
میلادِ مصطفیٰؐ کا ہے پیغام دوستو
چن چن کے نفرتوں کو مٹاؤ گلی گلی
میلادِ مصطفیٰ کی خوشیو ہے بڑی خوشی
جھنڈے اسی خوشی میں لگاؤ گلی گلی
جو لوگ تشنہ لب ہیں خدا کے لیے انہیں
عشقِ نبی کے جام پلاؤ گلی گلی
ہوگا کرم تو لائیں گے تشریف مصطفیٰؐ
دیوانو! اس خوشی میں سجاؤ گلی گلی
ساجدؔ لحد میں ہونی ہے نعتوں کی روشنی
عشقِ نبی کے دیپ جلاؤ گلی گلی

محمد امین ساجد سعیدی/حاصل پور

منو بھائی......شیشوں کا مسیحا رخصت ہوا

عامر بن علی/ جاپان

منو بھائی سے جب کوئی ان کا سن پیدائش پوچھتا تو اکثر مذاقاً ہٹلر کے جرمنی میں برسر اقتدار آنے کے واقعے کے ساتھ ملا کر 1933ء بتایا کرتے تھے۔ عہد ساز صحافی، نامور پنجابی شاعر، مقبول ڈرامہ نگار اور بائیں بازو کے اس عظیم دانشور کی موت کا دکھ اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ اب اس جیسا کوئی دوسرا نظر نہیں آرہا۔ جس منیر احمد قریشی کا نام احمد ندیم قاسمی نے منو بھائی رکھا تھا وہ چھ دہائیاں صحافت میں بھر پور طریقے سے سرگرم عمل رہے، مگر ان کے بدترین دشمن بھی ان کی دیانت کی گواہی دیتے تھے۔ نظریاتی مخالفین بھی اس اصول پرست شخصیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ طویل صحافتی کیریئر میں انہوں نے کبھی اپنے نظریات کی قیمت وصول نہیں کی۔ قلم کی حرمت کو پامال نہیں ہونے دیا۔ تمام زندگی منو بھائی نے اپنے قلم کو غریبوں کے حقوق اور کمزوروں کی حمایت کے لیے استعمال کیا۔ بے کسوں، مسکینوں اور لاچار و نادار لوگوں سے ان کو خصوصی محبت تھی۔ تمام زندگی اس مجبور محکوم طبقے کے لیے وہ قلمی جہاد کرتے رہے۔ چھ فروری 1933ء کو وزیر آباد میں اسٹیشن ماسٹر کے ہاں پیدا ہونے والے اس شخص کی وفات کے ساتھ ہی اردو صحافت کا ایک درخشاں عہد اپنے اختتام کو پہنچا۔

میری خوش قسمتی ہے کہ میرا ان کے ساتھ کافی وقت گزرا۔ ان کے ساتھ عقیدت مندی کا سلسلہ زمانہ طالب علمی سے شروع ہو گیا تھا۔ اسی نیاز مندی کا اظہار ہم دوستوں نے ''منو بھائی فین کلب'' کے قیام کی صورت میں کیا، اس کا نام انہوں نے خود تبدیل کر کے ''منو بھائی فرینڈز کلب'' رکھ دیا۔ متعدد بار میری دعوت پر میاں چنوں تشریف لائے اور مشاعروں میں شرکت بھی کرتے رہے۔ میرے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ میں نے منو بھائی پر بہت سارا تخلیقی کام کیا ہے۔ سوشلسٹ ہونے کے سبب انہیں معیشت اور سرمائے کی منصفانہ تقسیم کے موضوع سے خصوصی دلچسپی تھی۔ میں نے ان کے معیشت کے موضوع پر تحریر کردہ کالمز اور مضامین کو ان کی نگرانی میں اکٹھا کیا۔ مرزا غالب کے مصرعے ''باغ سے بازار تک'' کے نام سے یہ کتابی شکل میں یکجا ہوئے۔ جب میں نے ان کے اخباری کالمز انتخاب اور ان پر تحقیق و ترتیب کا کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو کہنے لگے! پہلے قیصر زیدی نے یہ کام شروع کیا تھا۔ مگر اس نوجوان صحافی کی اچانک رحلت کی وجہ سے یہ کام رک گیا تھا۔ پھر ایک طالب علم نے دوبارہ یہ ترتیب و تحقیق کا کام شروع کیا اور وہ بھی بدقسمتی سے وفات پا گیا۔ اب میں کسی تیسرے نوجوان کی جان نہیں لینا چاہتا ہوں۔ یہ خیر ان کی بزلہ سنجی اور شگفتہ طبیعت کا حصہ تھا، میں ذرا سخت جان ثابت ہوا اور معاشی کالمز ''باغ سے بازار تک'' کی صورت میں جمع ہو گئے۔

منو بھائی ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ بہت حساس، ہمدرد اور محبت بھرے آدمی تھے۔ مرنے والوں کی یاد میں ان کے تحریر کردہ کالمز ''جنگل اداس ہے'' کے نام سے شائع ہوئے جو کہ ادب کا شاہکار ہیں۔ مجھ سے بہر حال انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اس کتاب کا نام تبدیل کرنا چاہتے ہیں، ان کے بقول یہ اے۔ حمید کے کسی ناول کا نام بھی شاید پہلے سے تھا۔ پنجابی شاعری کی کتاب ''اجے قیامت نئیں آئی'' کے نام سے چند سال پہلے شائع ہوئی جس میں صرف نظمیں ہی ہیں۔ میں نے اس متعلق ان سے استفسار کیا تو کہنے لگے کہ غزل اردو زبان میں زیادہ ارتقاء پذیر ہو چکی ہے اور نظم ارتقائی اعتبار سے پنجابی میں زیادہ آگے ہے۔ اس لیے میں نے نظم کی صنف کو ہی چنا ہے۔ ڈرامہ نگاری کی بات کریں تو ''سونا چاندی'' ایسا شاہکار ہے جو کہ ہمیشہ پاکستانی ڈرامے کی تاریخ کے ماتھے کا جھومر رہے گا۔ منو بھائی کے ڈرامے کے کردار عام زندگی کے عوامی کردار ہوتے تھے۔ ہندوستانی ڈراموں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ یہ کس طرح کے کردار ہیں؟ ارب پتی بیگم صاحبہ، گھر میں سونے کے زیورات سے لدی، پھندی بیٹھی ہیں مگر اسی گھر میں ڈرائیور کا کوئی کردار نہیں اور بیگمات گاڑی خود چلاتی ہیں۔ نو سو کروڑ کے کاروبار کی بات ہو رہی ہے اور گھر میں باورچی نظر نہیں آرہا، یہ کس طرح کا ڈرامہ ہے؟ آخری عمر میں انہوں نے ڈرامے لکھنا ترک کر دیا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ یار اب میں کوکا کولا اور نیسلے کے لیے تو ڈرامہ نہیں لکھ سکتا۔

جمہوریت میں ان کا کامل ایمان تھا۔ ضیاء الحق کے آمرانہ دور میں بڑے مشکل حالات سے

گزرے مگر کلمہ حق بلند کرتے رہے۔ بھٹو خاندان کے ساتھ ان کی خصوصی محبت تھی، اس کی وجہ شخصی نہیں نظریا تی تھی، کیونکہ بھٹو صاحب نے پیپلز پارٹی کا جو بنیادی منشور پیش کیا، اس کے مطابق انہوں نے ''سوشلزم ہماری معیشت ہے کہ نعرہ دیا تھا''۔ منو بھائی راسخ العقیدہ سوشلسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ سید تھے، سا دھے مسلمان بھی تھے۔ وہ شکوہ کرتے تھے کہ روس کے کیمونسٹوں نے مذہب کو ہدفِ تنقید بنا کر برا کیا تھا، کیمونزم تو ایک خالصتاً معاشی موضوع ہے، پھر مذہب کے خلاف بکواس کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ وہ ایک ترقی یافتہ اور جدید پاکستان چاہتے تھے جہاں عدالتی انصاف کے علاوہ معاشی انصاف بھی موجود ہو۔ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے، حالات چاہے جتنے بھی مشکل کیوں نہ ہوں۔ پہاڑ جیسا حوصلہ چاہیے ایسی مسکراہٹ برقرار رکھنے کے لیے۔ اور پھر مسکراہٹیں بکھیرنے کی کوشش بھی کرتے۔ بیمار بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے۔ سندس فاؤنڈیشن کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی تھی۔ تھیلیسیما کے مریض بچوں کی وہ ہمیشہ خصوصی دلچسپی لے کر مدد کرتے اور تمام دوست احباب کو بھی مدد کرنے پر ابھارتے تھے۔ عمران خان کی دعوت پر اکثر شوکت خانم ہسپتال جاتے اور کینسر کے مریض بچوں کے لیے کتابوں کا تحفہ ساتھ لے جاتے۔ ان بچوں کے پاس بیٹھ کر انہیں کہانیاں سناتے تھے۔ میری عمران خان سے پہلی ملاقات بھی منو بھائی کی بیٹی کی شا دی میں ہی ہوئی تھی۔ مجھے یہاں ایک گواہی بھی دینی ہے۔ پرویز مشرف جب پاکستان کے صدر تھے تو وہ شوکت خانم ہسپتال آئے تھے۔ میری موجودگی میں عمران خان کا منو بھائی کو ٹیلی فون آیا اور انہوں نے پرویز مشرف کے لیے تقریر لکھنے کی فرمائش کی جو کہ انہوں نے لاہور کے کینسر ہسپتال میں فرمانا تھی، منو بھائی نے صاف انکار کر دیا۔ فون بند کرنے کے بعد مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے کیا پتا اس پاگل آدمی نے کیا بات کرنی ہے؟

منو بھائی کے اردگرد بہت سے صحافی اور ان سے کئی جونیئر قلم کار حکمرانوں سے مفادات اٹھا کر ارب پتی بن گئے مگر انہوں نے کبھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا چاہے اس کی قیمت انہیں جو بھی چکانا پڑی، ریواز گارڈن لاہور کے جس گھر سے ان کا جنازہ اٹھایا گیا، اس مکان کے باہر انہیں پلستر کروانے کے لیے بیس سال کا عرصہ انتظار کرنا پڑا۔ اس رہائش گاہ کے علاوہ انہوں نے چھ دہائیوں پر محیط اپنے فنی کیریئر میں کوئی جائیداد نہیں خریدی۔ ایک دن دوران گفتگو کہنے لگے کہ قیا مت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ کتابوں میں سے لفظ اٹھا لیے جائیں گے۔ منو بھائی کہنے لگے کہ اس سے مراد لفظوں کی تاثیر ہے، الفاظ غیر موثر ہو جائیں گے، ان کا اثر ختم ہو جائے گا۔ وہ خوش قسمت رہے کہ مالکِ کائنات نے تا مرگ ان کی تحریر کی تاثیر برقرار رکھی۔ ان کے لکھے ہوئے لفظ تادمِ آخر پر تاثیر رہے۔ منو بھائی پاکستانی صحافت کا ضمیر اور ادب کی شان تھے۔ دل مانتا ہی نہیں کہ وہ مردِ قلندر دنیا چھوڑ گیا۔ لگتا ہے ہمارے منو بھائی جو کہ جذباتی بھی بہت واقع ہوئے ہیں ہم سے ذرا سا روٹھ گئے ہیں، مان جا ئیں گے، پھر واپس آجائیں گے۔

ظفر اعوان/ڈنمارک

یوں نہیں ہے کہ روشنی کم تھی
جس جگہ میں تھا، چاندنی کم تھی
وہ ملا اور دیر بعد ملا
دکھ زیادہ تھا اور خوشی کم تھی
نام جس کا تھا زندگی یارو
در حقیقت ہمیں ملی کم تھی
اور کسی سے زیادہ کیا رکھتے
خود سے بھی اپنی دوستی کم تھی
تھا محبت کا ذکر ہر لب پر
اس کے بارے میں آگہی کم تھی
جتنی گزری تھی میرے دل پہ ظفر
کیفیت میں نے وہ لکھی کم تھی

....

وصل کی رات مجھے اب تو سفر کرنا ہے
مجھ کو جانا ہے ابھی جا کے کہیں مرنا ہے
اس لیے پار سمندر کے میں آیا ہوا ہوں
زخمِ غربت ہے مرا جس کو مجھے بھرنا ہے
ایسے رستے ہیں مرے سامنے، دیکھے ہی نہیں
انہی رستوں میں کہیں پیار کا بھی جھرنا ہے
جس کے ہاتھوں میں ہے تلوار فقط میرے لیے
اس کے قدموں میں کوئی پھول مجھے دھرنا ہے
کیسا انصاف ہے یہ کیسی عدالت ہے میاں
جرم اوروں کا ہے تاوان مجھے بھرنا ہے
زندگی دور وطن سے ہے غلامی کوئی
شور میں رہ کے ظفر آہٹوں سے ڈرنا ہے

''نگاہِ مصطفےٰ'' شاہدہ لطیف کی رُوحانی صوت

خورشید بیگ میلسوی/میلسی

شاہدہ لطیف اُردو ادب میں ایک معتبر مقام رکھتی ہیں۔ وہ چند خواتین واد با میں شامل ہیں جو فکر وفن کی کارگہ میں ہمہ وقت مستغرق رہتی ہیں۔ ان کا لمحہ لمحہ امر دو زبان کی خدمت کے لیے وقف ہوتا ہے۔ اس سے قبل ان کی نظم و نثر کی تخلیقات اس بات کی بین ثبوت ہے کہ ان کا مقصد اُردو ادب کے دامن کو وسیع کرنا اور اس میں امکانات کے متنوع رنگوں کو سجانا ہے۔ نگاہِ مصطفےٰ ان کے پاکیزہ اوارِ عشق مصطفےٰ کا آئینہ ہے۔ نعت لکھنا کارِ دارند ہے۔ اس صنف کی نزاکت اور حساسیت حمد و منقبت کے درمیان موجود ہے۔ ایک فارسی مقولہ ہے کہ با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار۔ یعنی خدا کی تعریف کرتے ہوئے دیوانگی کی حدوں کو چھو سکتے ہو لیکن سرورِ کائنات کی نعت لکھتے ہوئے خود کو پابند مقامِ مصطفیؐ کرنا ضروری ہے اور اس سلسلے میں یہ مصرع معروف ترین ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

جو انسان عشق مصطفےٰ کے شجر منور تلے بیٹھا رہتا ہے وہ جذب و کیف کی مستی میں رہتا ہے اس پر سرورِ کائنات کی خاص نگاہ ہوتی ہے اسی لیے شاہدہ لطیف نے نعت لکھنے والوں کے سینے منور کرنے کے لیے اپنی کتاب عنوان نگاہِ مصطفےٰ رکھا ہے اس کو خوبصورت ٹائٹل سے سجایا گیا ہے اور بہترین کاغذ استعمال کیا گیا ہے جو شاہدہ لطیف صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی (ادب و صحافت) کا طرۂ امتیاز ہے 160 صفحات پر مشتمل اس مجموعہ نعت میں جہاں عشق و عقیدت کی گرہ کشائی کی گئی ہے وہاں حضرت محمد مصطفیؐ کی مکی و مدنی زندگی کے واقعات کو بھی نعت کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے جو ان کے اسلوب کی ندرت ہے۔ اس سلسلے میں جبل ابوقیس، جبل نور، جبل ثور، صلح حدیبیہ، مقام بیعت رضوان، غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوہ خندق، غزوہ خیبر، یہودی عورت کے عنوانات دراصل نبی کی مکی و مدنی زندگی کے ان منور گوشوں کو نظمیہ ہیئت میں بیان کرنا ہے لیکن یہاں ہمارا موضوع نظم نہیں نعت ہے جس کے لیے انہوں نے غزل کا رنگ بھی اپنایا ہے اور مشکل قوافی میں اپنی عقیدت کی تازہ کاری رجائیت اور رمزیت سے سنوار کے نعت کو پیش کیا ہے کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ دل و دماغ پر تجلیاتِ مدینہ منورہ نقش ہو جاتی ہیں۔ کچھ اشعار دیکھیے:

چاند، سورج، کہکشائیں مستعار
آپؐ سے لی ہیں شعاعیں مستعار

....

کچھ لفظ جونہی نعت میں آئے چمک اُٹھے
تازہ ہوا میں جیسے پرندے چہک اُٹھے

....

اس خلدِ بے کراں کے بھی قابل ہوں کاش ہم
مونگے کے پھول ہیں جہاں نیلم کی گھاس ہے

قمر وارثی آپ کی نعت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''شاہدہ لطیف کی نعتیہ شاعری حضور اکرمؐ سے والہانہ عقیدت و محبت کا اظہار ہی نہیں ان کے سیاحتی مزاج کا آئینہ دار بھی ہے۔''

جو ہمارے اس دعوے کی تائید کرتی ہے کہ انہوں نے نعت میں نادر اسلوب اپنایا ہے اور یوں نعت میں عقیدت و سرمستی کے ساتھ ساتھ نعت کے امکانات ارتقا پذیر نظر آتے ہیں۔ جبکہ سید افتخار عارف نے اقبال کے اس شعر کا حوالہ دیا ہے جس میں نگاہِ مصطفےٰ کا ایک فکری تسلسل اقبال سے شاہدہ لطیف تک نظر آتا ہے اور وہ شعر یوں ہے:

دلش نادل! چرا نالد! نداند
نگاہے! یارسول اللہ نگاہے

اور اس تخلیقی مجموعے کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مدینہ کی گلیوں کی خاک کو سُرمہ چشم بنانے والی شاہدہ لطیف کا تخلیقی محرک وہ عقیدت ہے جو طیبہ کی زیارت کے وقت دل سوزی و دل گدازی پیدا کرتی ہے اور یہ افتخار عطا کرتی ہے کہ زائر کی آنکھیں تجلیاتِ روضہ مصطفےٰ سے وہ عہد کشید کر رہی ہیں جب آپ مکہ اور مدینہ کی گلیوں میں خیر کا پیغام لے کر وحی الٰہی کے ترجمان تھے اور آپ کی مثالی شخصیت کی صداقت و امانت اعلانِ رسالت سے قبل دھوم پا چکی تھی۔ ویسے تو سیرت نگاروں نے ہی ان معجزات کا حوالہ کتابوں میں دیا ہے جو آپ کی ولادتِ باسعادت کے وقت دنیا

میں وجود پذیر ہوئے۔ یعنی قیصر و کسریٰ کے محلات کے کنگرے گر گئے۔ آتش کدہ فارس بجھ گیا۔ تاہم آج بھی کروڑوں مسلمان حج کے موقع پر زیارت طیبہ کو فریضہ عشق سمجھتے ہیں۔ روضے کی جالیوں سے انہیں رحمت عالم کے ہونے کی خوشبو نصیب ہوتی ہے۔ اگر عقیدت کی آنکھیں سرمہ سعادت سے لبریز ہوں اس بات کو محترمہ شاہدہ لطیف یوں بیان کرتی ہیں:

حسنِ نگاہِ مصطفیٰؐ میری طرف کو دیکھنا
کب سے کھڑی ہوں بے نوا میری طرف کو دیکھنا

....

زندگی بھر جو کی وفا اس کا ملے مجھے صلہ
سامنے ہو جب کبریا میری طرف کو دیکھنا

یوں فنی اعجاز کے مرتبے پر بدستور وہ فائز نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر ریاض مجید رقم طراز ہیں:

''شاہدہ لطیف کا رنگ نعت عام شاعرات سے مختلف ہے۔ اس کی انفرادیت کا ایک تعلق ان نعتیہ زمینوں سے ہے جو شاہدہ لطیف کی نعتوں میں ندرت، شگفتگی اور والہانہ پن کی حامل ہیں۔''

اور ڈاکٹر ریاض مجید نے تخصیص سے اس بات کو دہرایا ہے کہ اس کاوش میں آمد بھی ہو جاتی ہے اور اس بات کی گواہی دی ہے کہ شاہدہ لطیف کی شاعری میں ایسا کئی مقامات پر ممکن ہوا ہے۔ یوں شاہدہ لطیف نعت کے اُفق پر ایک نیا مہتاب فکر وفن لے کر آئی ہیں جس کی کرنیں قلوب عشاق کو منور کرتی ہیں۔ جس کا ہر ہر لفظ عقیدت و عشق میں ڈوبا ہوا ہے جس میں روایت اور جدت دونوں کے پہلو اُجاگر کیے گئے ہیں۔ شعری رمزیت کے حسن سے بخوبی آگاہ شاہدہ لطیف کے کچھ اشعار دیکھیے:

سبھی صحیفوں کے لفظ و بیاں سمجھتی ہوں
ازل سے آپ ہیں روحِ اذاں سمجھتی ہوں

....

جو دنیا بھر میں پھیلاتا ہے اپنے نور کی کرنیں
مری نظروں میں اس گنبد کی تصویر ہے آقاؐ

....

عجب اک روشنی دیکھی مدینے کی اُفق پر
چمکتی دلکشی دیکھی مدینے کی اُفق پر

یوں ان کی عقیدت نے کہیں رنگوں اور خوشبو کی بات کی ہے کہیں گلوں کہیں قمر و مہر کی کہیں ستاگران کی۔ جتنے بھی حسین ترین سلیقے اور قرینے بیان کے آپ کے ذاتِ بالا سے معتبر نظر آئے انہیں لفظیات کی نعت میں شاہدہ لطیف نے شعر کا پیکر عطا کیا تاکہ وظیفہ نعت سرائی کا عمل تابندگی حاصل کر سکے۔ نعت دراصل سیرت نگاری بھی ہے اور عقیدت نگاری بھی۔ اس لیے سرورِ کائنات کی حکمت عملی اور تبلیغ اسلام کے تمام واقعات کا شعری بیان شاہدہ لطیف کے اس نعتیہ مجموعے کی شان ہے جن کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ آپ کی مکی زندگی کن خوبیوں سے عبارت تھی اور آپ کی مدنی زندگی کن اوصاف سے مزین تھی۔ آپ کی سیرت کا یہ مطالعہ ہر مسلمان کی عقیدت اور جذبہ عشق کو بڑھاتا ہے۔ ہم اس شعر پر اپنا مضمون تمام کرتے ہیں اور شاہدہ لطیف کے ساتھ ہم نوائے دعا ہوتے ہیں:

میرے آقاؐ میری مٹی کو درخشاں رکھنا
ارضِ بے رنگ کو ہم رنگ گلستاں رکھنا

نعت

لب شاعر سے جو ذکر شاہِ خوباں نکلا
چرخِ افکار سے اک نیّرِ تاباں نکلا
پردۂ شب سے کوئی مہرِ درخشاں نکلا
سوئے افلاک وہ اللہ کا مہماں نکلا
دلِ فگارِ شہہ لولاک مدینے کو چلا
دل سے برسوں سے سمایا ہوا ارماں نکلا
دیکھو طیبہ کے سفر سے وہ تو گھر لوٹا
گھر سے جو سوئے حرم بے سروساماں نکلا
جب سے اُس پیکرِ رعنا کا تصور باندھا
ذہن سے میرے خیالِ مہہ کنعاں نکلا
خارِ طیبہ گلِ گلزار کا ہم دوش ہوا
ذرۂ ریگِ حرم لعلِ بدخشاں نکلا
بلبلِ طیبہ کو نغمہ نہ کوئی اچھا لگا
یہ ترے عشق کی منزل کا حدی خواں نکلا
تیری اُلفت کا امیں جس کو بنایا حق نے
میرے نزدیک وہی صاحب ایماں نکلا
عزت نفس بھی قائم رہی دامن بھی بھرا
کوئی سائل نہ ترے در سے پشیماں نکلا
مستقل اُن کا ٹھکانہ بھی ہے فردوسِ بریں
خلد تو اپنے لیے کوچۂ جاناں نکلا
تیری توصیف نے جذبوں کو طہارت بخشی
اسمِ احمد مری ہر بات کا عنواں نکلا
جب بھی سرکارؐ کی مدحت کا ثمر قصد کیا
لفظ و معنی کا زباں سے کوئی طوفاں نکلا

عبدالسلام ثمر/ بہاول پور

تم محبت کا استعارہ ہو

نوید مرزا/لاہور

"تم محبت کا استعارہ ہو" معروف شاعرہ لبنیٰ صفدر کا نیا شعری مجموعہ ہے۔ جس میں محبتوں کے سارے موسم مہکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ موجودہ دور شاعری کا ہے اور اس میں محبت ایک ایسا موضوع ہے جس نے اردو غزل کو ایک طویل عرصے سے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ محبت کو اپنی روح میں رچا بسا کر شاعری کرنے والی ایسی ہی ایک شاعرہ لبنیٰ صفدر بھی ہیں جنہوں نے اپنے شعری اظہار کے لیے محبت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کے رکھا ہے۔ لبنیٰ صفدر کی شاعری محبت کی تیز آنچ سے گزر کر کندن بنی ہے۔ بقول نذیر قیصر "لبنیٰ صفدر نے کہا "تم محبت کا استعارہ ہو" اور یہ معجزہ نما کلمہ کہتے ہی وہ خود محبت کا استعارہ بن گئی ہیں۔"

محبت کا روشن ستارہ اور استعارہ بننے والی لبنیٰ صفدر کی شاعری کی بنیاد محبت کی مٹی میں گندھ کر جذبوں کی شدت اور تازگی کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے۔ وہ اس انمول جذبے کی خوشبو سے سرشار ہو کر ہر لحہ محبوب سے ملنے کے لیے بے قرار نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری میں "صاحب" کا لفظ ایک استعارے کی صورت اُبھرتا ہے اور وہ بار بار اس مجموعے میں محبوب کو صاحب کے نام سے پکارتی چلی جاتی ہیں۔ اُردو شاعرات کے حوالے سے دیکھا جائے تو تو یہ یقینی طور پر ایک نیا تجربہ ہے۔ اس تجربے کی طرف ایوب خاور کچھ اس طرح تبصرہ فرماتے ہیں "لبنیٰ صفدر کے اس مجموعے میں یہ 'صاحب' ایک کردار کے طور پر ظاہر ہوا ہے۔ اگر میری اس بات کو تھوڑی دیر کے لیے ایک شاعرانہ حقیقت مان لیا جائے تو آگے آنے والی مختلف غزلوں میں لبنیٰ نے اس کردار کی ایک ایسی کہانی بنائی ہے جو "محبت کے استعارے" کو مکمل کرتی ہے۔

اس حقیقت سے واقعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "صاحب" کے اس کردار نے کتاب میں جابجا اپنی جگہ بنا رکھی ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

دل پہ جذبوں کا راج ہے صاحب
عشق اپنا مزاج ہے صاحب
آپ کو بھول ہی نہیں پائی
میرا کوئی علاج ہے صاحب
سامنے کی مثال ہے صاحب
عشق میرا کمال ہے صاحب
عشق ہوتا ہے زندگی جیسا
آپ کا کیا خیال ہے صاحب
تیری خاطر سنبھال رکھا ہے
یہ جو پھولوں کا تھال ہے صاحب
آپ کو مجھ سے پیار ہے صاحب
باعث افتخار ہے صاحب
آپ آئے تھے خواب میں میرے
یہ جو تھوڑا خمار ہے صاحب

اس طرح کے اور بھی کئی اشعار ہیں جو ایوب خاور کی بات کو سچ ثابت کرتے ہیں۔

لبنیٰ صفدر کا تعلق شاعرات کے اُسے قبیلے سے ہے جنہوں نے بہت تیزی سے اپنا ایک امیج بنایا ہے اور یہ سب کچھ ان کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ وہ ایک مکمل شاعرہ ہیں اور انہوں نے شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ عطاء الحق ان کی شاعری سے اس وابستگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں "لبنیٰ صفدر کا چھٹا شعری مجموعہ "تم محبت کا استعارہ ہو" شاعری کے ساتھ اس کی گہری وابستگی کا مظہر ہے۔ اس کے نزدیک شاعری جز وقتی کام نہیں بلکہ محبت کی طرح کل وقتی ہے۔ اس نے شاعری میں اپنا آپ بسر کیا ہے۔ اس لیے شعر اُس کے اندر سے اس طرح پھوٹتا ہے جیسے شاخ سے کونپل پھوٹتی ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ شاعری کی دیوی لبنیٰ صفدر پر مہربان ہے اور وہ چند برسوں میں کئی شعری مجموعے منظر عام پر لے آئی ہیں۔ محبت ان کا بنیادی موضوع ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے پاس دیگر موضوعات کی کمی ہے۔ لبنیٰ نے عصر حاضر کے بہت سے معاملات اور رسائل کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ان مختلف حوالوں سے ان کے چند شعر دیکھیں:

غریبوں کو گھٹا مہنگی پڑی ہے
کہ بارش کی دعا مہنگی پڑی ہے
جلایا بھی بجھایا بھی اُسی نے
چراغوں کو ہوا مہنگی پڑے گی

....

یہ مناسب نہیں ہے، ہواؤ نہیں
جو ہیں روشن دیے وہ بجھاؤ نہیں

....

کون پرندوں کو سمجھائے
ہجرت نقل مکانی میں ہے

....

زندگی اس طرح گزارتے ہیں
جیسے تاوان بھر رہے ہیں لوگ

....

کاغذوں پر نظر نہیں آتے
شعر جو آنسوؤں کے اندر ہیں

لبنیٰ صفدر کے اس مجموعے کی ایک اور خوبی بھی

متاثر کن ہے کہ انہوں نے اپنے شعری اظہار کے لیے سادگی اور بے ساختگی کو مدنظر رکھا ہے جو اچھی شاعری کا حسن ہے۔ امجد اسلام امجد نے شاعرہ کی اس شعری خوبصورتی کو اس طرح بیان کیا ہے: ''تم محبت کا استعارہ ہو'' میں آپ کو جگہ جگہ ایسے اشعار ملیں گے جو خوبصورت اور خیال افروز ہیں اور نہیں اظہار کی سادگی اور بیان کی سہولت نے مزید دلکش اور پرلطف بنا دیا ہے۔''

لبنیٰ صفدر ایک اچھی شاعرہ تو ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ نثر لکھنا بھی جانتی ہیں۔ تبھی انہوں نے کتاب کے اندر اپنے تحریر کردہ دیباچے میں محبت کے حوالے سے کیا خوب لکھا ہے چند سطریں آپ بھی پڑھیں: ''رزق قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ محبت بھی تو رزق ہے جو ہر ایک کو اپنے اپنے حصے کا رب کائنات کی طرف سے دلوں کے صحن میں من وسلویٰ کی طرح اُتار دیا جاتا ہے۔''

میں لبنیٰ صفدر کو اس خوبصورت مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ ان کا یہ شعری سفر اسی خوبصورتی اور کامیابی سے جاری ہے۔ (آمین) آخر میں حسن عباسی کی ان کے لیے چند خوبصورت سطریں قارئین کے لیے پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ حسن عباسی لبنیٰ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''لبنیٰ صفدر کی شاعری میں ہمیں زندگی کے مختلف شیڈز اور رنگ ملتے ہیں اور اس نے شاعری کے کینوس پر ان رنگوں کو اس سلیقے سے برتا ہے کہ نہایت دل پذیر پینٹنگز رونما ہوئی ہیں جن کے مختلف زاویے زندگی کے نئے معانی و مفاہیم پیدا کرتے ہیں۔ لبنیٰ صفدر کا تازہ شعری مجموعہ زندگی سے جڑی ہوئی شاعری کا مرکب ہے۔ محبت اس کی شاعری کا سب سے معتبر حوالہ ہے۔''

مجھے یقین ہے کہ محبت کے اسی معتبر حوالے سے لبنیٰ صفدر کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

خالد مسعود/ لاہور

جہاں میں ہم نہیں ہوں گے تو کیا ہوگا
یونہی سورج اُبھرتا ڈوبتا ہوگا
کوئی تصویر کر لے کاش وہ لمحہ
کبھی جب میرا اُن سے سامنا ہوگا
رہوں کیوں بدگماں میں اُس کے بارے میں
زیادہ سے زیادہ بے وفا ہوگا
کروں کیوں غیر سے شکوہ گلہ جا کر
ملا جو دُکھ وہ اپنوں سے ملا ہوگا
یہاں ٹکڑے گریبانوں کے اُڑتے ہیں
یہاں دیوانہ مجھ سا ہی رہا ہوگا
اگر بولوں تو وہ ناراض ہو جائے
رہوں خاموش تو مجھ سے خفا ہوگا
تمہارا دور غالبؔ مانتے ہیں ہم
کوئی مسعودؔ بھی اس دور کا ہوگا

سعید پسروری/ لاہور

اندر سے حیوان ہیں اندر جھانکیں تو
باہر سے انسان فرشتوں جیسے ہیں

....

حوالہ روشنی بن جائے گی محبت کا
چراغ اُس کے مرے درمیان رکھ دینا

....

ہے دو رنگی کا نمونہ آج کا انسان بھی
خوش رہے اللہ میاں اور خوش رہے شیطان بھی

....

کانٹا نکالا بغض کا قلب کو صاف کر دیا
اُس نے سلام جب کیا میں نے معاف کر دیا

علی رضا کا تازہ نعتیہ مجموعہ

اردو زبان وادب کا اعزاز وافتخار یہ بھی ہے کہ اسلامی ملکوں میں بولی جانے والی زبانوں میں سب سے کم عمر زبان ہونے کے باوجود حمد ونعت ومنقبت اور سلام ومراثی کا جیسا ذخیرہ اس میں موجود ہے کسی دوسری زبان میں نظر نہیں آتا۔ عربی اور فارسی میں عظیم المرتبت اور مقبول عام نعتیں لکھی گئی ہیں۔ مگر مجموعی طور پر اردو کا دامن بے حد ثروت مند نظر آتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے شعراء نے خاص طور پر اپنے روحانی احساسات وواردات کو اپنے عقیدہ وعقیدت کو اللہ کریم اور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مدح وثنا کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ حالی، امیر مینائی، اقبال، محسن، حفیظ جالندھری اور ان کے بعد احسان دانش، ماہر القادری، اقبال عظیم، بہزاد لکھنوی، حافظ مظہر الدین مظہر، حفیظ تائب، عبدالعزیز خالد، مظفر وارثی، خالد احمد، اعجاز رحمانی، صبیح الدین رحمانی کے بعد اعلیٰ درجے کے نعت گو شعرا اپنی عقیدتوں کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ گزشتہ چند دہائیوں سے اردو شاعری میں کثرت سے حمدیں اور نعتیں لکھی جا رہی ہیں۔ بہت اچھی نعتیں اور کچھ بہت اچھی نہیں بھی مگر رضا کی نعتیں سرکار ختمی مرتبت ﷺ سے اُن کی خالص ومخلص ارادتوں کی آئینہ داری بھی کرتی ہیں اور شاعر کے زبان وبیان پر دسترس کی بھی گواہ ہیں۔

برادر عزیز علی رضا نے اپنے پیش نظر مجموعے میں فنی معیارات کے ساتھ اپنے روحانی تجربات وواردات کو نظم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق میسر آئے، جذبہ سچا ہو، توجہ راسخ ہو تو اللہ کریم شعر کو تاثیر کی نعمت سے مالا مال کر دیتے ہیں اور عوام کی طرف سے بھی اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ بارگاہِ اقدس میں یہ نذرانے قبولیت کے شرف سے ہمکنار ہوں گے۔ ہمیں اس کے لیے دل سے دعا کرنی چاہیے۔

افتخار عارف

حسنِ سخن میری نظر میں

(خالد مسعود کے شعری مجموعے ''بے ساختگی'' کا پیش لفظ)

خالد مسعود/ لاہور

کوئی پوچھے کہ خاکسار کا پیش لفظ کیا ہے تو ہم یہی کہیں گے کہ تازگی، شگفتگی، رعنائی، زیبائش، برجستگی، خود کلامی، سادگی۔ صاحبِ دیوان ندرتِ خیال کے شیدائی ہیں اور فقیر کو رفعتِ تخیل کی جستجو ہر دم رہتی ہے۔ اظہارِ خیال محتاجِ الفاظ ہے۔ بسا اوقات الفاظ خیال کا حجاب بن جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ کی نگاہ اُس خیال پر بھی رہے جو اشعار میں موجود ہو اور اُس خیال پر بھی جس کا دامنِ الفاظ میں سمٹنا محال لگے۔ سبھی کلیاں گلستانِ نشاطِ روح اور گلشنِ زینتِ دل سے چُنی گئیں۔ کہیں جذب و مستی ہے، کہیں کیف و سرور ہے۔ کہیں رنگ و نغمہ ہے۔ لیکن خدا کا نور ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ آگہی بھی ہے تحیر بھی ہے، وجد بھی ہے، جنوں بھی ہے۔ جمالِ حُسن اور جلالِ عشق کے جلووں کی رعنائیاں عروسِ خیال سے آراستہ اشعار میں ڈھل کر رنگ و نور کی روشن کرنیں بن کر جگمگ جگمگ کرنے کو بیتاب ہیں۔ ہر شعر اذنِ پذیرائی کا طلب گار ہے۔ یہ نگارش پڑھنے والے کی رائے کو قبل از وقت متاثر کرنے کی کاوش ہرگز نہیں، یہ دل کی باتیں ہیں۔

لاہور فقیر کا دل ہے اور خاکسار کا ذہن انتہائی شاعرانہ ہے۔ لیکن یہ حُسن و عشق کا بیان ہی سخن نہیں بلکہ فطرت کی منظرکشی جیسے کہ نیلا آسمان، چنچل بادل، بادِ صبا، نیلگوں سمندر، جھرنے، بہتے دریا، فلک بوس پہاڑ، سرسبز درخت، گل و چمن اور اس کے ساتھ ساتھ مسائلِ زیست، تلخی و جبر، ظلمت، عروج و زوال، کیفیاتِ نفس، تخیل، خواب، مثبت اور منفی رویے سبھی سخن کے موضوعات ہیں۔ زندگی خوشی خوشی جینے کے لیے بھی بہت کم ہے لیکن لوگوں کے غیر متوازن رویے اور سوچ اسے زہر آلود کر دیتے ہیں۔ اور زندگی درد کی کہانی بن جاتی ہے۔ لیکن حکایاتِ درد کا حد سے زیادہ بیان اسے مزید تلخ بنا دیتا ہے۔ لہٰذا دل گداز اور دلکش طرزِ سخن ہی معراجِ سخن ہے۔

انسان بھی ایک عجیب عالمِ طلسمات ہے۔ فکر کے رنگ گونا گوں، بات کے ڈھنگ بوقلموں، کبھی دل پر بنی ہوئی، کبھی دل سے ٹھنی ہوئی، خود ہی جال بچھاتا ہے۔ خود ہی شکاری ہے اور خود ہی شکار ہے۔ بڑی پہچان یہ ہے کہ بعض کام بغیر ضرورت کے بھی کرتا ہے۔ سخن سازی سے نئی چیز پیدا کرتا ہے۔ فنِ سخن میں بے تکلفی، برجستگی اور تہذیب و متانت کا طلب گار ہے۔ یہی حالت آواز کے اتار چڑھاؤ اور لفظ کے الٹ پھیر کی ہے۔ خاص قسم کی رسیلی اور سُریلی آوازوں سے موسیقیت کی متناسب سرگم وجود میں آتی ہے۔ خوبصورت اور طرحدار!

حُسن، روپ، ظاہر کے ذریعے ''باطن'' کا اظہارِ سخن ہے۔ خدا کی شبیہ ہے۔ حُسن کی وجہ سے دنیا میں ہمیشہ ہنگامہ برپا رہا ہے۔ لیکن اکثر لوگ حُسن کو جمالیاتی معنوں میں نہیں برتتے بلکہ معمولی معنوں میں استعمال کر جاتے ہیں۔ یعنی حُسن سے بالکل بے بہرہ اور ذوقِ سلیم سے بالکل کورا انداز۔ زوال پذیر معاشرے میں سخن اپنی تہی دامنی کو حُسن کے پردے میں چھپانے کا نام ہے۔ یہ جس کو حُسن کہتے ہیں وہ دراصل جزو ہے اور میلانِ حُسن کا مخصوص تصور ان کا ذہنی پیمانہ ہے۔ جس سے وہ ہر چیز کا حُسن ناپتے ہیں۔ اسے جمالیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس ذہنی مرض کی جڑیں عمیق ہیں۔ یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔

اُمنگ بھرا زمانہ سخن وہ ہے جس میں قوتِ عمل جوش میں ہوتی ہے اور قوتِ باطنی کے اظہار سے ایک نئی دنیا پیدا کی جاسکتی ہے۔ خدا کی کائنات میں داخل ہوں تو سوز و فکر سے دل بیدار ہوتا ہے۔ داخلی قدوں سے باہر نکلنا، مناظرِ فطرت کی جانب متوجہ ہونا اور کیفیات و مشاہدات کا بیانِ سخن زندگی ہے۔ ساغرِ حیات ہے۔ خلوصِ بیاں حُسنِ سخن ہے۔ جسے جمالیات میں حُسن کہتے ہیں وہ اصلاً شکل سے، پیکر سے، انداز سے تعلق رکھتا ہے۔ حُسن کے مدارج نہیں ہیں۔ اعلیٰ درجہ سخن موضوع اور معانی کے ذریعے طے ہوتا ہے۔

ہلکے پھلکے اشعار کہنے کے لیے کاریگری کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک پیمانۂ فکری یعنی غزل ردیف اور قافیے کی پابندیوں کے ساتھ موجود ہے۔ روایاتِ تغزل موجود ہیں۔ نئی بات کہنا مشکل ہے۔ نئی بات کہنے کے لیے الفاظ کا سینہ چیر کر اُن کو نئی اہمیت بخشنی پڑتی ہے۔ اظہار کے لیے پیکر خود تراشنا ہے۔ سخنِ معانی کے دُرِ نایاب کو رشتۂ الفاظ میں پرونا ہے۔ صبرِ بے کراں اور حوصلۂ بلند چاہیے۔

حُسنِ سخن میں شکل و پیکر کو سامنے رکھتے ہوئے موضوع و معانی کی بلندی، مطالب کا اچھوتا پن، فکر کی توانائی اور صحت مندی فراموش نہ ہونی چاہیے۔ سخن کی عظمت اور حُسن کا تعلق اصلاً معانی و مطالب اور شاعر کی شخصیت سے ہے۔ فطرت حقیقت کے چہرے پر ایک نقاب ہے۔ سنگ و خشت، خطوط و رنگ اور الفاظ عالمِ باطن کے کوائف کے اظہار کا وسیلہ ہیں۔ شاعر کائنات کی ہر چیز پر حکمران ہو کر فطرت کے وسیلوں پر

غالب آ کر خام شے کو شکل دیتا ہے۔ جو پہلے اس کے باطنی وجود میں پیدا ہوتی ہے۔ فطرت کے محرکات کا مقابلہ کر کے جو "ہونا چاہیے" وجود میں لانا کٹھن ہے۔ یہی زندگی اور توانائی ہے۔ باقی انحطاط ہے۔ تخلیقِ پیہم زندگی ہے۔ تلاشِ دنیائے نو ہے۔ ایسے سخن میں سادگی، صفائی، روانی اور قطعیت ہونا چاہیے۔ آرائشِ الفاظ ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طلسم سے بچتے ہوئے اصل چیز مغز و روح ہے کہ حسن یعنی شکل کی نسبت سخن سے وہی رہے جو اظہارِ مطالب اور تخلیقِ معانی کے لیے ضروری ہے۔ سخن کا نازک پودا خونِ جگر سے سینچا جاتا ہے۔ اور اس کے رنگ و بُو کا حُسن شاعر کی شخصیت کا حُسن ہے۔

ماحول کے خلاف بغاوت کرنا، اسے اپنے سانچے میں ڈھالنا، رکاوٹوں کو اپنے وجودِ معنوی میں جذب کر کے آگے بڑھنا، نت نئی آرزوؤں، نت نئے معیاروں کو سامنے رکھنا زندگی ہے۔ یہ زندگی ہے تو خودی بھی ہے۔ اس کے سوا ہر چیز موت ہے۔ فسانہ و فسوں ہے۔ اس معیار کے حصول میں جو سخن معاون ہے وہ مشعل راہ ہے کیونکہ زوال پذیر شاعر کا ایک شعر قوم کے لیے چنگیز خان کی غارت گری سے زیادہ مہلک ہے۔ مظاہرِ یزداں کی توانا سرمستیوں میں جھومنا زندگی ہے۔ سخن میں رعنائی، مٹھاس، شوخی، تیکھا پن اور سوز چاہیے۔ توانائی، عالی حوصلگی اور موسیقیت چاہیے۔ جو پوشیدہ قوتوں کو ابھار کر آوازوں کے اُتار چڑھاؤ سے ایک نئی دنیا کے وجود کی خبر دے اور فتح کا مژدہ بھی سنائے۔ لفظوں کی تیز حرکت سے گرمیٔ حیات کے اشارے پیدا ہوتے ہیں۔

اردو زبان کی شُستگی اور آہنگ میں اتنا ترنگ ہے کہ اس میں کہا گیا شعر کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اپنا ہی شعر لگتا ہے اور اس سے محبت ہمیں یکجا ہونے کا احساس بھی عطا کرتی ہے۔ ہمارے پرانے شاعر عظیم تھے لیکن ان کی شاعری زیادہ تر ان کے اپنے دور کی عکاس ہوا کرتی تھی۔ عہدِ نو کے نوجوان شاعر ایسے ایسے خیال توڑ کر لاتے ہیں کہ اُس کا نشان بھی اساتذہ کے ہاں نہیں پایا جاتا۔ ایک عجیب سی خوشبو ایک اچھوتا سا مزہ ملتا ہے مگر ہم کب جواں سال شاعروں کو مانتے اور جانتے ہیں۔ کہ ہم تو ان کو پڑھتے ہی نہیں۔ فقیر بھی کی تحسین اور حوصلہ افزائی کے لیے ملتمس ہیں۔ لوگ کہتے ہیں آج کوئی غالب نہیں، کوئی میر نہیں، جب نئے شاعروں نے وہ کہہ ڈالا جو میر و غالب نہ کہہ سکے تو پھر مان لینا چاہیے کہ میر بھی ہیں غالب بھی ہیں۔ یہ کلام بھی اندازِ نو اور فکرِ نو کی اڑتی اڑتی سی تازہ خبر ہے۔

یہ سخن حُسن و خوشبو آشنا دل و دماغ پہ التفات ہے اور سبھی احباب و ہم نشینوں کو خوش خبری و دعوتِ عام ہے کہ صحنِ چمن سے گلاب کی کلیاں اور گل مجتمع کر کے خوش رنگ گلدستہ پیشِ خدمت ہے۔ کچھ پھول گلاب کے، کچھ پھول موتیے کے بھی ہیں۔ جنہیں نہایت سلیقے سے آراستہ کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ جذبۂ شوق نے وہ آتشِ گل بھڑکائی ہے کہ یہ آگ دلوں کو پگھلا بھی سکتی ہے اور بزم کو روشن بھی کر سکتی ہے۔ اپنے ہنر سے آگ پیدا کرنے والا اور آتش پرست کو اس کے اعمالِ بد کے بدلے میں آگ میں جلا ڈالنے والا خوب جانتا ہے کہ تلاش کرنے والا ایسی تابناک آتش کے حصول کے لیے بیقرار ہے۔ ہر چمنستاں، ہر گلستاں سے چیدہ چیدہ گل ہائے سخن اور انواع و اقسام کی خوشبو و رنگ لیے یہ گلدستہ سخن چہار سُو اپنی تازگی اور شگفتگی سے اس جہاں کو معطر کرنے کو بیتاب ہے۔

خاکسار ذاتِ یزداں کا سپاس گزار ہے جو دل کو سخن سے تابناک بنا دیتا ہے۔ اس کی آتش تابناک کا ایک شرارہ خاکسار فقیر نے اپنے خاکستر میں پایا تو اس کے ذریعے سینے کی خلش بڑھی تو کلام زینتِ دل سے قرطاس پہ منتقل ہوا۔ الفاظ روشن چراغوں سی تابندگی لیے اور گلابوں کی خوشبو سے مزین کشاں کشاں اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں شاید کہ دماغوں کو معطر کرنے کی خوبی پیدا ہو جائے۔

فقیر اپنے عشقِ اوّل غزلیات کے انتخاب کے بعد رباعیات اور حمد و نعت کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنی والدہ مرحومہ کے لیے لکھے گئے مرثیے پہ کلام کا اختتام کرتے ہیں۔ فقیر امید کرتے ہیں کہ اہلِ سخن حضرات، ہم نشیں اور قدرداں اس تراوشِ خامہ گل ہائے سخن کی ستائش سے ممنون فرمائیں گے۔

اس موسیقیوں کی سرگم اور گل و رنگ و نغمۂ سے مہکتے گلدستے کی ملکوتی زیب و زینت کو اک حسیں باغباں وجود میں لا رہا ہے۔ باغباں جس کا نام خالد مسعود ہے جو گزشتہ اٹھائیس برس سے ایک وفاقی تحقیقاتی ادارے سے بطور ڈپٹی چیف سائنٹسٹ منسلک ہے، جس کے پچیس سے زائد سائنسی تحقیقی مقالے عالمی معیاری جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور حلقۂ احباب میں خالد کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کا تخلص مسعود ہے۔ جو لاہور میں پیدا ہوا اور جس کی سکونت بھی ثمن آباد لاہور میں ہے۔ اسے آخر میں مدینے میں دفن ہونے دیا جائے۔

خاکِ راہ

فقیر

(تاریخ پیدائش: 19 اکتوبر 1961ء)

kmasoodinmol@yahoo.com

''بھولے بسرے شہر کے لیے ایک نظم'' کا تجزیہ

ڈاکٹر فرزانہ کوکب/ملتان

بھولے بسرے شہر کے لیے ایک نظم

میناروں پر کچے آم کی خوشبو جیسی اک بے نام سی صبح
اور اس میں اک چھوٹے سے سر اور بڑے بدن کا
(شاہ دولے کے چوہے جیسا) آنکھیں ملتا شہر
کب سے اونگھ رہا تھا
کہنہ قلعے کی دیواریں تو گردش دوراں چاٹ گئی تھی
رکن عالم (رح) کے روضے پر گداگروں کا قبضہ تھا
اور جالی میں جھانکتی کرنوں سے روزانہ
سورج آ کر منہ دھوتا تھا
خلق خدا بھی دیکھ کے اس کو شرماتی تھی
ہوٹل تاج کو جاتی رہ پر
لگے ہولنق پوسٹروں کو دیکھ کے شہر کو کھجلی آتی تھی
میناروں پر
کچے آم کی خوشبو جیسی دھوپ کو جب پہچان ملی تھی
خواجہ فرید (رح) نے میرے گھر کے دروازے پر
دستک دے کر پوچھا تھا
میں نے جو احساس کی گٹھڑی تجھ کو سونپی تھی
اس کو کھول کے دیکھا ہے؟
تب میں دیپ جلنے سے پہلے
شہر کو چھوڑ کے بھاگ آیا تھا

(نظم ڈاکٹر افتخار شفیع)

....

ماہ و سال کے بہاؤ میں قرنوں کا سفر طے کرنے والے تاریخی شہر ملتان نے اپنے وجود کو بڑے اہتمام کے ساتھ برقرار رکھا ہے۔ ملتان اپنے تہذیبی و تمدنی پس منظر کی بدولت برصغیر پاک و ہند میں ایک منفرد اور جداگانہ مقام رکھتا ہے۔ اس کہنہ شہر کے بارے میں حضرت امیر خسرو (رح) سے منسوب ایک شعر زبان زد عام ہے:

ملتان ما بہ جنت اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کند

ملتان کو گرد، گرما، گدا و گورستان کا شہر کہا جاتا ہے۔ بہ ظاہر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ بعد میں (بہ قول جسٹس اے آر کیانی اب اس شہر کی پہچان آم، مخدوم، حلوہ اور خرما ہے)۔ ملتان بہت سے حوالوں سے اپنی پہچان رکھتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب سید علی ہجویری رح نے لاہور کو ملتان کا نواحی شہر قرار دیا تھا۔ معروف شاعر اور نقاد ڈاکٹر افتخار شفیع کی زیر تجزیہ نظم اس شہر کی بے پناہ علمی و تہذیبی فضا میں ایک حیرانی کے ساتھ وارد ہوتی ہے۔ نظم کے آغاز ہی میں کچے آم کی خوشبو اور میناروں جیسے الفاظ لانے کا مقصد اس شہر (مدینۃ الاولیا) کی تاریخی اور سماجی فضا کو علامتی انداز میں بیان کرنا ہے۔ تاریخی اعتبار سے سمرقند اور بخارا کی تہذیبوں کے مقابل ایستادہ یہ شہر ملتان ان گنت خوبیوں کا حامل ہے۔ ملتان کے لیے دولے شاہ کے چوہے جیسا شہر اور آنکھیں ملتا ہوا، اونگھتا ہوا شہر کے الفاظ شاید یہاں نامناسب ہیں۔ یہ تلمیح یا تشبیہ تو پنجاب کی ایک درگاہ سے متعلق ہے۔ جہاں بعض مقاصد کے تحت نومولود بچوں کے دماغوں کو محدود کرنے کی مذموم کوشش کی جاتی ہے، ظاہر ہے صاحب مزار کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا، البتہ موجودہ دور میں اس سے مراد جنوبی پنجاب کے عوام ہوسکتے جو اپنے حقوق کا ادراک نہیں رکھتے۔ اسی لیے شاید فکری اور شعوری لحاظ سے دولے شاہ کے چوہے ہیں جو اپنی سادگی اور دوسروں کی عیاری کے سبب مدتوں سے استحصال کا شکار ہیں۔ اس سے مراد وہ عملی بے بسی ہے جو سیاسی کساد بازاری کے سبب کوچہ و بازار میں سرعام ناک رگڑتی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں ملتان کی علمی اور ادبی تاریخ کو بڑی حد تک نظرانداز کیا گیا ہے۔ نظم آغاز ہی سے ایک افسانوی ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔

اہل شہر کا اونگھنا اور آنکھیں ملنا بود و نابود کے درمیان کہیں کسی تذبذب کی کیفیت کی نشان دہی کرنا تو نہیں؟۔ یہ صورت حال تو اس تمام خطے کی عکاسی کرتی ہے جو شعور و آگہی کا منبع ہونے کے باوجود اپنے مستقبل کے حوالے سے بے یقینی کا شکار ہے۔ سلسلہ سہروردیہ کے معروف بزرگ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی (رح) کے پوتے اور ان کے دوسرے سجادہ نشین جناب شاہ رکن عالم سہروردی (رح) کے روضہ اور تاج ہوٹل ملتان کی ادبی بیٹھک قدیم اور جدید عہد کا علامتی سنگم ہے۔ ہولنق پوسٹروں سے آنے والی کھجلی عالمی صارفیت کے کلچر کی ترجمانی کرتی ہے جہاں مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام اپنی تمام تر چمک دمک کے ساتھ مع اپنی مکروہات ہے موجود ہے۔ سورج کا مقدس خانقاہ سے پھوٹنے والی

کرنوں سے منھ دھونا اس روحانی فضا کی تجدید کی طرف اشارہ ہے، جس نے اس شہر کے گرداگرد ایک نورانی ساہالہ بنا رکھا ہے۔ واضح ہو کہ صدیوں پہلے اس شہر میں سورج دیوتا کی پوجا بھی کی جاتی تھی۔

افتخار شفیع کی یہ نظم شہر ملتان کے حوالے سے زمانہ ماضی میں اپنی وابستگی اور زمانہ حال میں اس شہر کی یادوں کے زیر اثر ماضی کی ایک خاص کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ اپنے جذبات کے لیے جان دار اسلوب پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نظم میں تمثیل نگاری کے ساتھ خوب صورت امیجز کا استعمال اس نظم کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔

اس نظم کی تہ در تہ پرتوں کو کھولتے ہوئے الفاظ کے دروبست کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کا وجودی کرب بھی لامحسوس طریقے سے دکھایا گیا ہے۔ یہاں فرد اور اس کی تنہائی ایک جدا انداز سے سامنے آتی ہے۔ نظم گو کہتا ہے:

خواجہ فرید نے میرے گھر کے دروازے پر
دستک دے کر پوچھا تھا
میں نے جو احساس کی گٹھڑی تجھ کو سونپی تھی
اس کو کھول کے دیکھا ہے؟
تب میں دیپ جلے سے پہلے شہر کو چھوڑ کے بھاگ آیا تھا

یہاں افتخار شفیع کے ہاں ژاں پال سارتر کے الفاظ کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، یوں یہ نظم وجودیت کا اچھا خاصا سلوگن بن جاتی ہے۔ سارتر اپنی سوانح عمری میں کہتا ہے:

i had tried to take refuge from
glory,
and dishonour in the loneless
of true self;
but i had not true self :i found
nothing
with my axcept a surprised
inspidity

اس نظم کے اختتام پر اس المیے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو اگر انسان میں پیدا ہو جائے تو احساس ندامت کی وجہ سے وہ اپنا مقام و مرتبہ کھو دیتا ہے، اس عظیم کرداری خوبی کا نام احساس ہے۔ اس سے پہلے کہ احساس کی ضو ندھم ہو چار طرف بے حسی کا اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ شاعر اپنے اندر موجود تمام احساسات اور جذبات اپنے اندر سمو کر، اپنے ذہن و دل میں اسے محفوظ کر کے وہاں سے چلا آتا ہے۔۔۔ اس کا اس طرح فرار اختیار کرنا دراصل اکیسویں صدی کی سماجی ٹوٹ پھوٹ کی عکاسی کرتا ہے۔

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: **القمر انٹرپرائزز**، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

پھلواری

اسلام عظمی/لاہور

کوئی ایک ماہ قبل دبئی سے تابش زیدی نے مجھے ای میل کے ذریعے حافظ سہیل انجم کی کہانیوں کے مجموعے ''پھلواری'' کا مسودہ بھیجا اور پیش لفظ لکھنے کے لیے کہا۔ میں ابھی یہ مسودہ پڑھ بھی نہیں پایا تھا کہ بسلسلہ جشن ڈاکٹر زبیر فاروق متحدہ عرب امارات سے بلاوہ آ گیا۔ وہاں جہاں پرانے دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں وہیں نئے لوگوں سے شناسائی بھی ہوئی۔ ان میں سے ایک حافظ سہیل انجم بھی تھے۔ سلیمان جاذب کی رہائش گاہ پر میں حافظ سہیل انجم کا پہلا مجموعہ ''۔۔۔۔۔'' نظر سے گزرا۔ اسے پڑھ کر اس لیے خوشی زیادہ ہوئی کہ پردیس میں شاعری تو خوب پھلتی پھولتی ہے مگر نثری مجاہد کم کم نظر آتے ہیں۔ نثر لکھنا فراغت مانگتا ہے اور اس کی نوک پلک سنوارنا کارے دارد ہے۔

حافظ سہیل انجم کا تعلق پنجاب کے سرحدی علاقے سے شکر گڑھ ہے، جو سیلابوں کی زد میں رہنے کی وجہ سے خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکا۔ حافظ سہیل انجم کا مشاہدہ توانا ہے اور گرد و پیش اُن کی پر نظر گہری ہے۔ کہانی کہنے اور لکھنے کے ہنر سے وہ خوب آگاہ ہیں۔ افسانے ''بریانی'' اور ''آستانہ'' اور ''سانولی'' وغیرہ اس کی عمدہ مثال ہیں۔

حافظ سہیل انجم کے موضوعات جانے پہچانے ہیں۔ اور اُن کی کہانی قاری کو دیکھی بھالی لگتی ہے۔ کہانی سے اُٹھنے والی آواز قاری کو اپنے دل کی آواز لگتی ہے۔ اُن کی کہانی آغاز سے انجام تک قاری کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ وہ اپنے مشاہدے کے خمیر سے کہانی ترتیب دیتے ہیں۔ اُن کے ہاں اجنبیت کا احساس نہیں ہے۔ حقیقت نگاری اور لفظی تصویر کشی کے ضمن میں وہ خوب مہارت رکھتے ہیں..... تاہم یہاں پر یہ کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ ہنروری کا سفر وقت طلب ہے اور مسلسل ریاضت مانگتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش اسے جلا بخشتی ہے۔ ہیرا زیر زمین بھی ہیرا ہی ہوتا ہے مگر تراش اسے کوہِ نور بنا دیتی ہے۔ مشاہدے کی پیش کش اسے قیمتی بنا دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حافظ سہیل انجم یہ جانتا ہے۔ اُن کے افسانے ''بریانی سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

دس سالہ مانی جو بھوک سے نڈھال تھا سہم گیا۔

وہ وہاں سے تھوڑا سائڈ پر ہو جاتا ہے جہاں سے وہ اس جگہ کو دیکھ سکتا تھا جہاں کھانا پھینکا جاتا تھا مگر اُسے ہوٹل کا مالک نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ دیوار کی آڑ میں بیٹھا گھٹنوں کے اوپر اپنی ٹھوڑی رکھ کر سوچنے لگا کہ آج کچھ بھی ہو جائے، وہ رانی کے بریانی لے کر ہی جائے گا۔ رانی کئی دنوں سے بریانی کی ضد کر رہی ہے۔ پچھلے روز بھی وہ پھینکی ہوئی بریانی لینے کے لیے آیا تھا مگر خالی ہاتھ لوٹا تھا۔ اچھا یہ ہوا کہ اس کی واپسی تک رانی بریانی کی ضد کرتے کرتے سو گئی تھی۔

مسجد اور مزار ہمارے معاشرے کا اہم جزو ہیں۔ جب فریاد کے لیے کوئی کندھا نہیں ملتا تو بے سہارا شخص یہاں فریاد کر کے اپنے دکھوں کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے۔ ان دونوں کے حوالے سے مولوی بھی اہم ہے۔ انگریزی میں آپ انھیں Necessary Evil بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ مہد سے لحد تک زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔ افسانہ ''آستانہ'' میں انسانی فطرت، مذہبی میلانات کی خوب نشاندہی اس طرح کی ہے۔

یہاں مجھے ایک مولوی صاحب کی ایک بات یاد آ گئی ہے۔ اسے لکھے دیتا ہوں۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ..... ''ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ مولوی نے معاشرے کو تباہ کر دیا ہے۔ مگر یہ بھی تو سوچیں کہ آپ نے ہمارے ذمے کیا کام لگائے ہیں۔ بچے کے کان میں اذان دینا، نماز کے لیے بلانا، نماز پڑھانا، نکاح پڑھانا اور جنازہ پڑھانا..... ہم نے کبھی ان میں کوتاہی کی ہو تو بتائیں۔ کبھی ہم نے کسی کے بچے کے کان میں اذان کے بجائے اپنے بچے کے کان میں اذان دے دی ہو۔ غلط وقت پر اذان دی ہو یا نماز پڑھائی ہو۔ کسی اور کے نکاح کے موقع پر اپنا نکاح پڑھا لیا ہو یا کسی کے جنازے کے موقع پر کسی اپنے کا جنازہ پڑھا دیا ہوں۔

ان سطور کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ یک طرفہ بیانیہ لکھنے والے کی غیر جانب داری کو مجروح کر دیتا ہے۔ کہانی کار پر لازم ہے کہ وہ تصویر کے دونوں رُخ بیان کرے۔ ہر واقعہ دوسرے واقعات سے جڑا ہوتا ہے اور بعض اوقات ردِعمل ہوتا ہے۔

حافظ سہیل انجم نے جہاں اپنے گرد و پیش سے موتی چنے ہیں وہیں پر افسانوں ''پھلواری'' اور ''کیوں'' میں داخلی سطح پر بھی اپنا اور معاشرے کا تجزیہ کیا ہے۔ پھلوای میں وہ تلاشِ ذات سے گزرے ہیں اور کیوں میں انسانی سائیکی پر بات کی ہے۔ یہاں پر ''کیوں'' سے ایک اقتباس۔

''اس کے برعکس کبھی انسان بہت خوش ہوتا ہے۔ اُس کو اپنے خوش ہونے کی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ انسان خوشی کے مارے ہواؤں میں پرواز کر رہا ہوتا ہے۔ کوئی اس سے تلخ بات کرے یا اس کو تکلیف پہنچائے تو

وہ جواب میں شائستگی سے کام لیتا ہے۔ اس کو غصہ نہیں آتا۔ بنا کسی وجہ کے خوش ہونا اور بنا کسی وجہ کے پریشان ہونا ہماری زندگی کا حصہ ہے۔ ہماری زندگی میں ''وجہ'' کتنی اہمیت رکھتی ہے؟ خوش ہونے کی وجہ، رنجیدہ ہونے کی وجہ۔ کچھ کرنے یا نہ کرنے کی وجہ۔ ہونے یا نہ ہونے کی وجہ۔ پانے اور کھونے کی وجہ۔ ملنے اور بچھڑنے کی وجہ۔ اس کے باوجود کہ ہماری زندگی میں لفظ ''وجہ'' کی بہت زیادہ اہمیت ہے مگر پھر بھی کبھی کبھار ہم بغیر کسی وجہ کے پریشان ہوتے ہیں اور کبھی بغیر کسی وجہ کے بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں۔''

اپنے افسانوں ''مالا'' اور ''تقسیم'' میں حافظ سہیل انجم نے سرحد کے آر پار جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں پر مجھے اپنا شعر یاد آ گیا ہے۔

تو پھر آنکھوں میں سپنے ایک سے کیونکر نہیں اگتے
لکیروں کے اگر دونوں طرف انسان ہوتے ہیں

کہا جاتا ہے کہ بے عقیدہ ہونا بھی ایک عقیدہ ہے۔ عقیدہ رکھنا مثبت عمل ہے مگر اسے دوسروں پر بزور مسلط منفی۔ تقسیم کے لفظ سے مجھے اتفاق نہیں ہے اور یہ ایک خاص فکر نے منفی رویے کے طور پر اپنایا ہے۔ حافظ سہیل انجم نے اس موضوع سے متعلق ذہنی کشمکش کا بیان افسانہ ''تقسیم'' میں یوں کیا ہے۔

اس تقسیم نے بڑے خاندان اجاڑے ہیں۔ کچھ لوگ آزاد ہو گئے ہیں اور کچھ ابھی بھی قید ہیں۔ کچھ کے گھر آزاد ہیں مگر عبادت گاہیں نہیں۔ کچھ کے شمشان گھاٹ آزاد ہیں مگر قبرستان نہیں۔ کچھ جسمانی طور پر آزاد ہیں مگر ابلاغی طور پر نہیں۔ پتہ نہیں یہ تقسیم آگے جا کر کیا گل کھلائے گی۔ ڈر ہے کہ کہیں یہ خطہ تقسیم در تقسیم نہ ہوتا چلا جائے۔ میں ایک آزاد کشمیری ہوں مگر حقیقت میں آزاد نہیں ہوں۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ اس تقسیم نے سب کچھ چھین لیا ہے۔ یہ کس طرح کی آزادی ہے جہاں قبرستان بھی آزاد نہیں ہیں۔ میں اپنی بیٹی کی قبر پر فاتحہ خوانی نہیں کر سکتا کیونکہ میں ایک مسلمان ہو۔ کچھ بھی کر لیں، نہ مجھ سے میری کوئی مسلمانیت چھین سکتا ہے اور نہ میری ذات سے لفظ کشمیری کو کوئی دور کر سکتا ہے۔ میں جو تھا وہی ہوں۔ میں کشمیری تھا میں کشمیری ہوں، میں کل بھی مسلمان تھا اور آج بھی مسلمان ہوں۔ میرے پاس سب کچھ ہے مگر اس سب کچھ سے نہ میں اپنی اولاد خرید سکا ہوں اور نہ ہی آزادی' اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

حافظ سہیل انجم دبئی میں ایک پاکستانی ایئر لائن سے منسلک ہیں اور ائر پورٹ پر اس کی پروازوں کے نگران ہیں۔ اُس کا سیکڑوں لوگوں سے روزانہ واسطہ پڑتا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ اپنے تازہ تجربوں کی بنیاد پر وہ درجنوں نئی کہانیاں کشید کرتے رہیں گے۔ مشاہدات کے حوالے سے اُن کا افسانہ ''مان صاحب'' توجہ چاہتا ہے۔

میں حافظ سہیل انجم کی صلاحیتوں کے بارے میں پُر اُمید ہوں۔ اُنھوں نے افسانہ نگاری کے پہلا مرحلے سے جو مشاہدات کی قلم بندی سے متعلق ہے، کامیابی سے گزر چکے ہیں۔ جہاں اُن کے موضوعات متنوع ہیں، وہیں وہ اوائل جوانی کی محبت کی تشریحات بھی اُن کی کہانیوں کا خاصہ ہے۔ اس دور میں محبت کا روایتی روپ اعصاب پر حاوی رہتا ہے۔ دینی اور دنیاوی کرداروں پر مخصوص اثرات غالب ہوتے ہیں او رواجی فکر، لکھنے والے کی قلم پر حکومت کرتی ہے۔ مگر یہ دور عارضی ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ راست فکری کو بھی تحریر کرنے کا عمل نمو پانے لگتا ہے اور راست فکری ہی تخلیقی عمل کو جلا بخشتی ہے۔

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

اِذنِ حضوری

نازاوکاڑوی/لاہور

جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلعم سے اجازت۔ اور یہ بھی طے ہے کہ خدا اور اُس کے رسول جسے چاہیں عطا کرے یا جنہیں اِذن عطا ہو وہی نعت لکھتا ہے۔ میرے مشاہدہ میں ہے اکثر شاعر حضرات نعت لکھنے سے گریزاں' پُوچھنے پر عذر یہ کہ کہیں ادب و احترام میں کمی نہ آ جائے الفاظ شایانِ شان مستعمل نہ ہوں سکیں اس لئے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ دہریہ قسم کے لوگوں سے بھی خُدا نے نعت لکھوالی جیسا کہ خدا خود حضور کی بڑائی کرے اور کرنے کا حکم صادر کرے تو پھر ہم کون کہ پیچھے رہیں۔

پروفیسر قیصر ہاشمی بھی حمد و نعت لکھ نہ پا رہے تھے اور مُلتجی سے آسمان کی طرف دیکھتے اور ندامتی اشکوں سے لبریز اِذنِ حضوری کی طلب دِل میں کسک لئے دُعا گو ہوتے' بالآخر اِذن عطا ہُوا تو دِل مائل بطرف حضور کونین رحمۃ للعلمین سرورِ کونین و دوسرا کے حضور اشکوں کا نذرانہ لئے درِ مُرسلین پر حاضری دینے اور اپنی محبت کا اظہار کرنے لگے۔

جب تک بکا نہ تھا کوئی پوچھتا نہ تھا
آپ نے خرید کر انمول کر دیا

کے مِصداق پروفیسر قیصر ہاشمی نعت گوئیوں میں شمار ہونے لگی اور خود مدحتِ سرکار میں سرشار رہتے ہوئے نعتوں کا نذرانہ پیش کرنے لگے جب الفاطون نے ذخیرے کا رُوپ دھارا تو اسے کتابی شکل دینے کی تڑپ ہونے لگی بالآخر اِذنِ حضوری سے ہی ''اِذنِ حضوری'' معرضِ وجود میں آئی تو عاشقانِ رسول نے سرآنکھوں پر بٹھایا ہم عصروں نے آپ کی قسمت پر رشک کرتے تو توصیف و ستائش کے ساتھ مبارکبادیں دیں تو قیصر ہاشمی صاحب عجز و انکسار کا مجسمہ بنے حضور ﷺ ہی کی عنایت جانا۔

اِذنِ حضوری سے چیدہ چیدہ مدحتِ رسول میں کہے گئے کچھ اشعار پر نظر ڈالیں تو قیصر ہاشمی صاحب کی دِلی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جیسے حمد کا یہ شعر:

ترے شایانِ شاں ہے کبریائی
بُجز تیرے کسے حاصل بڑائی

اِذنِ حضوری کو یوں بیان کرتے ہیں:

شان میں آپ ﷺ کی میں نعت کہوں
ہے عطا آپ ﷺ کی مرا اُسلوب

اپنے اس شعر میں دیکھیں قیصر ہاشمی کیسے مُلتجی نظر آتے ہیں:

تری مدحت کی خاطر وقف کر دوں
مجھے ایسا ہُنر ایسی زباں دے

اگرچہ ہر عاشقِ رسول اسی دُعا کا طالب نظر آتا ہے۔

درج ذیل شعروں میں دیکھیں مَعبد اور معبود کو ایک ساتھ کیسے جوڑ رہے ہیں۔ پروفیسر قیصر ہاشمی صاحب نے اپنے کمالِ فن اور موزوں الفاظ کے ساتھ اُسلوب بیان کو منفرد کر دیا ہے۔

محرمِ سِر لا الٰہ وہی
عظمتِ رَبّ کا ہے وہ زندہ شہود

اس ﷺ سا بے مِثل عبد ہو گا کہاں
فخر کرتا ہوں جس ﷺ پر خُود معبود
رَبّ ہے طالب اور آپ ﷺ ہیں مطلوب
آپ ﷺ بس آپ ﷺ رَبّ کے ہیں محبوب

ان کے لئے ہی وقف یہ اعزاز ہو گیا
رَبّ ہو جو میزبان تو مہماں حضور ﷺ ہیں

نعت کا لُغوی معنی دیکھا جائے تو سرورِ کونین رحمت اَرض و سماء شفیع المذنبین کی مدح سرائی ہی تو ہے۔ مدح سرائی بھی محبوب کی تو کی جاتی ہے پھر وہ محبوب جو سارے جگ کا ہو محبوب جو اپنے رَبّ کا ہو تو کون ہے جو اس اعزاز سے محروم رہنا چاہے گ جنہیں عشقِ مصطفیٰ حاصل ہو جائے تو وہ دُنیا سے ماورا ہو کر اپنے محبوب کو عشق میں مُبتلا ہونے پر فخر محسوس کرتا ہُوا اپنے محبوب کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے نہ ملائے تو اور کیا کرے۔ دیکھیں قیصر ہاشمی صاحب اپنی عقیدت کے پھول یوں نچھاور کر رہے ہیں:۔

ترے خُلق و بصیرت اور اَوصافِ حمیدہ سے
دِلوں سے مِٹ گئے خدشے چھٹی گُہرِ پشیمانی

....

تم ختم رُسل شاہِ اُمم ہادیٔ دیں ہو
ہر دِل کی تشفی ہو ہر اِک دِل میں مکیں ہو

پھر عشقِ مصطفیٰ میں دِل بسمل کیا کیا نہیں کرتا۔ دُعائیں بھی مانگتا ہے۔ اِلتجائیں بھی' تمنائیں بھی کرتا ہے تو مائل وابستگی بھی یوں اس طرح مائل دُعا ہوتے ہیں قیصر ہاشمی ہے۔

محرمِ سِر لا الٰہ وہی
عظمتِ رَبّ کا ہے وہ زندہ شہود

....

کبھی نہ ذکرِ محمد ﷺ سے میں رہوں غافل
میں اس یقین کی بس آج ابتدا کر لوں

یا یوں گویا ہوتے ہیں:

اگر میں ذکرِ محمد ﷺ کو جزوِ جاں کر لوں
سکونِ قلب ملے اور بھلائی مل جائے

اگر چہ نعت میں کچھ تبدیلی دیکھنے کو مل رہی ہے ہوسکتا ہے کسی کو میری اس بات سے اختلاف ہو یہ سب کا حق ہے آجکل یہ سمجھا جا رہا ہے کہ اپنے اشعار میں شہرِ مدینہ (یہ بھی غلط ہے) مدینہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہی شہر ہے۔ لکھ لیں یا ذکر کر لیں گنبدِ خضراء اور جالیوں کا ذکر بھی نعت کا ہی حصّہ ہوگا یا ہوتا ہے۔ جبکہ ابتداء میں نعت کے لغوی معنی ذکر کیے گئے ہیں۔ التجائیں، دُعائیں، تمنائیں، عرض گذریاں یا اپنی سسکیاں، آہ وزاریاں آجکل ان کا چلن عام ہُوا جا رہا ہے۔ یہ سب حضور ﷺ کے ہاں پیش تو کی جا سکتی ہیں لیکن یہ نعت میں شمار نہیں ہوسکتیں قیصر ہاشمی صاحب نے بھی ایسا کرنے کی کوشش کی ہے دیکھیں یہ شعر:

خُدایا مجھ پر کرم اپنا خاص تُو کر دے
مجھے بھی روضۂ اقدس کی اِک جھلک دِکھلا

اب یہاں روضۂ اقدس کی بناء پر یہ شعر نعت میں شمار ہو رہا ہے۔ بلاشبہ قیصر ہاشمی لفظوں کی حُرمت جانتے ہیں، میں شاعری کے رموز سے بھی آشنا ہیں فن شاعری کے تمام تر لوازمات کا استعمال بھی اِستعارے کرنا ہے، اشارے، تشبیہات، شعروں میں انفرادیت بھی، جامعیت بھی، مقصدیت اور آفاقیت بھی ان کی شاعری کو معتبر کرتی نظر آتی ہے۔ بلاشبہ ان کی تصنیف قابلِ ستائش بھی ہے اور قابلِ نوشت بھی۔ میری دُعا ہے اللہ تعالیٰ قیصر ہاشمی کی اس حضوری کو اپنی بارگاہ میں حاضری تصور کر لیں۔ آمین ثم آمین۔

قمر حجازی فکر و فن کے آئینے میں

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال

محترم قمر حجازی صاحب عرصہ دراز سے نگارِ سخن کے گیسو سنوار رہے ہیں۔ انہیں زبان و بیان پر یکساں عبور ہے۔ اتنی پختہ فکری طویل ریاضتِ فن کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں بڑی مہارت اور خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ ان کی کتاب ''محبت'' میں جہاں انسان کے فطری جذبے محبت کی شاندار ترجمانی کی گئی ہے وہاں ان کے الفاظ کی سحر کاری نے ایک حاضر سماں باندھا ہے۔ انہیں الفاظ کو برتنے کا ایک خاص سلیقہ حاصل ہے۔ قمر حجازی صاحب کے دیگر کتابچے پنجابی زبان پر ان کی غیر معمولی دسترس کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ حال دلے دا (غیر منقوط کلا) قمر دی جگنی، قمر دے چھند، باراں ماہ قمر، جھوک میرے یار دی اور گھڑولی میں پنجابی زبان کے تہذیبی و ثقافتی عناصر کو جس خوبصورت اور جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کا جواب نہیں۔ ''مہکتے ماہیے'' قمر حجازی صاحب کا وہ شعری کارنامہ ہے جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ پنجابی کلچر کو اُردو ماہیوں میں پیش کرنا ایک مشکل کام تھا جسے قمر حجازی کے خامہ معجز رقم نے بڑی سہولت سے سرانجام دیا ہے۔

طاہر عدیل/ ڈنمارک

یونہی لمحے گزرتے جائیں گے
پھول کھل کھل بکھرتے جائیں گے
جانتے ہیں بہت خراب ہیں ہم
وہ ملا تو سنورتے جائیں گے
جتنا ہم کو دبائیں گے دُشمن
ہم تو اتنا اُبھرتے جائیں گے
کیا خبر تھی کہ سیڑھیوں سے وہ
میرے دل میں اُترتے جائیں گے
آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیں گے اُس کو
پھول قدموں میں دھرتے جائیں گے
زندگی اُس کے دم قدم سے ہے
ہر قدم دم ہی بھرتے جائیں گے
ہے دُعا ماں کی ساتھ گر طاہر
دھول میں بھی نکھرتے جائیں گے

....

میں جس دن سے تم پہ ہی مرنے لگا ہوں
اُسی دن سے مرنے سے ڈرنے لگا ہوں
میں خود روکتا تھا زمانے کو جس سے
وہی کام اب آپ کرنے لگا ہوں
سنا ہے کوئی عشق کی حد نہیں ہے
میں حد سے بھی آگے گزرنے لگا ہوں
مجھے نیند آتی نہیں دیر تک اب
میں آنکھوں کو خوابوں سے بھرنے لگا ہوں
کہ خود کو ہرا کر تمہیں جیتنا تھا
تمہیں جیت کر خود ہی ہرنے لگا ہوں
غلط سمت کی بس میں، میں چڑھ گیا تھا
سو چوراہے میں اب اُترنے لگا ہوں
نظر کوئی اُٹھنے لگی میری جانب
یونہی بیٹھے بیٹھے نکھرنے لگا ہوں
میں جس آئنے میں بگڑتا تھا طاہر
اُسی آئنے میں سنورنے لگا ہوں

ہمہ جہت تخلیق کار ------ راجا نیئر

اقرا شوکت

فنونِ لطیفہ کے حوالے سے گزشتہ رُبع صدی میں چند ایسے نام اُبھر کر سامنے آئے ہیں جو ہمہ جہت ہونے کے باعث معاصرین میں الگ دکھائی دیتے ہیں۔

ایک عام مشاہدے کے مطابق شاعر، ادیب، کالم نویس اور مصور اکثر اپنے اپنے شعبوں تک ہی محدود نظر آتے ہیں، مگر چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک سے زیادہ شعبوں میں بھی اپنا منفرد نام اور پہچان بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک ہمہ جہت شخصیت راجا نیئر کی بھی ہے۔

میں راجا نیئر کا ذکر کرنا اس لیے بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ فنونِ لطیفہ کے دیگر شعبوں کی بات ہو اور راجا نیئر کا نام شامل نہ کیا جائے تو یہ منظر نامہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص بیک وقت شاعر، ادیب، مصور، صحافی اور براڈ کاسٹر کیسے ہو سکتا ہے، پھر خیال آتا ہے کہ شائد اُس کے پاس کوئی جادو کا چراغ ہو گا۔ جس کی بدولت وہ ہر شعبے میں خود منوانا جانتا ہے، خیر یہ محض ایک ذاتی رائے ہے۔

ادب سے ناتا جڑنے کے بعد میں نے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو تواتر سے پڑھا لیکن شاعری ہو یا ڈرامہ، فیچر ہو یا مضمون راجا نیئر کی انفرادیت نے ہر جگہ مجھے مسلسل ایک تحیّر میں مبتلا کیے رکھا اور شائد یہ مضمون بھی اسی تحیّر آمیز جستجو کا نتیجہ ہے۔ راجا نیئر سے میرا پہلا ادبی تعارف بطور مضمون نگار ہوا۔ اُس کے لکھے ہوئے مضامین میں "ناصر کاظمی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، اجمل نیازی، اختر شمار اور عمران نقوی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہیں۔ انھی مضامین نے مجھے اُس کی مزید تحریروں اور شاعری پڑھنے کے لیے مہمیز کیا۔

راجا نیئر کی شاعری میں محبت، غم زمانہ، مسائل حیات کلچر، تہذیبی روایات اور انسانی زندگی کی نت نئی بدلتی ہوئی صورت حال کچھ یوں نظر آتی ہے کی قاری دم بخود رہ جاتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

یہ محبت عجیب نشہ ہے
آخری سانس تک اُترتا نہیں

بیٹھے ہیں بارشوں میں کاغذ کی ناؤ پر
سانسیں لگی ہوئی ہیں ہماری بھی داؤ پر

جس نے مجھ کو سنبھال رکھا ہے
میں نے وہ ہجر پال رکھا ہے

دشمنِ جاں سے دل لگا بیٹھا
خود کو خطرے میں ڈال رکھا ہے

آج پھر اپنی اک ضرورت پر
دل نے قربان کر دیا مجھ کو

محبت کے تناظر میں اُبھرتی یہ شاعری پڑھنے والے کو اپنی زندگی اور محسوسات کی گرفت میں لے کر عجیب و غریب دلکشی سے بھر دیتی ہے۔ خصوصاً شام کے حوالے سے چند اشعار دیکھیے:

سرمئی شام کی آغوش میں لپٹے ہوئے رنگ
اپنی پہچان بناتے ہوئے مٹ جاتے ہیں

شام کی دہلیز پر سورج نے پیشانی دھری
اور دشتِ ہجر کی رنگت سنہری ہو گئی

تو نے اپنی ہنسی ملا کر موسم میں
شام کا سونا منظر آج نکھار دیا

فطرت کی آغوش میں پلنے والے جذبے
وقتِ شام جھلکتے ہیں کئی رنگوں میں

اسی طرح محسوساتِ زندگی، انسانی جذبات اور شعور ذات کو راجا نیئر نے جس ہنر مندی کے ساتھ شعر میں سمویا ہے یہی وہ منفرد اور پُرکشش انداز ہے جو اسے اپنے معاصرین میں ممتاز کرتا ہے۔

زندگی کی تمام تر مشکلات اور تکلیف دہ مسائل کے باوصف اُس کی شاعری میں محبت جیسے اعلیٰ جذبے اور وارفتگی کے نکھرتے، بکھرتے منظر نامے نہ صرف پڑھنے والے کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں بلکہ درد سے بھرنے کا انمول تجربہ بھی عطا کرتے ہیں۔ یہ تمام مناظر کھلی آنکھوں سے فطرت کا مشاہدہ کرنے والے انسان کے ہاں تو ابھر سکتے ہیں لیکن اپنی ذات میں مقید لوگ ان جذبات و احساسات سے آشنا نہیں ہو پاتے، اور یہی راجا نیئر کی شاعری کا خاصہ ہے۔

راجا نیئر کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے احمد عقیل روبی نے لکھا ہے: "راجا نیئر سچ لکھنے والے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کرنا اس کی فطرت میں شامل ہے۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ ایک مصور اور عکاس بھی ہے۔ تبھی تو اُس کی شاعری روایت اور جدت کے حسین سنگم پر تشکیل پاتی ہے۔"

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں: "راجا نیئر کی شاعری میں محبت

کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے اہم مسائل خوب صورتی کے ساتھ تخلیقی سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ وہ آج کے سماجی و ثقافتی منظرنامے کا گہرا ادراک رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں عہد کے دکھوں کے ساتھ اپنے کلچر سے بے پناہ محبت اور بدلتی ہوئی اقدار کے حوالے سے نہایت عمدہ اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں۔" یہ شعر دیکھیے:

کل اِک سکول وین نے اُس کو کچل دیا
اخبار بیچتا تھا جو تعلیم کے لیے

راجا نیئر کی شاعری میں تازگی بھی ہے اور دل کشی بھی۔ آیئے مزید چند اشعار دیکھتے ہیں:

لفظ تو اپنے معانی سے کہیں بہتر تھا
پیاس کا ذائقہ پانی سے کہیں بہتر تھا
اُس کی آنکھوں کا محبت سے بھرا لہجہ تو
میرے اظہار زبانی سے کہیں بہتر تھا

عشق ہوں اور ایک راز میں ہوں
چاہتوں کے حسیں گداز میں ہوں
میرے سینے سے تو لگا ہوا ہے
اور میں حالتِ نماز میں ہوں

یاد کر کے ڈوبتے سورج کا منظر دیر تک
چیختا رہتا ہے کوئی میرے اندر دیر تک
دل میں اُٹھتا ہے تمہارے وصل کا احساس تو
اُڑتا رہتا ہے یہ شیرازی کبوتر دیر تک

شاعری کے ساتھ ساتھ راجا نیئر کے دیگر اوصاف میں مصوری کا ذکر کرنا از حد ضروری ہے کیوں کہ وہ جس محبت اور خلوص کے ساتھ اپنی "دھرتی ماں" پنجاب کو پینٹ کرتا ہے وہ اُس کی ذات کا اہم ترین حصہ بھی ہے اور ایک مکمل تعارف بھی۔ یوں تو ادبی رسائل وجرائد اور ادبی کتب کے 300 سے زائد سرورق راجا نیئر کو مصور کی حیثیت سے متعارف کرنے کے لیے کافی ہے، تاہم آج کل وہ آئل پینٹنگ کے ذریعے سے لینڈ اسکیپ بنانے میں مصروف ہے۔ پنجاب کی مٹی، دھرتی، درخت، کھیت، بیلے اور جنگل وغیرہ کو منفرد انداز سے پینٹ کرنے میں کوشاں ہے۔ ان لینڈ اسکیپ میں سب سے اہم چیز ان کی لاجواب کمپوزیشن اور دلکش مناظر ہیں جو بلا شبہ لائق ستائش و تحسین ہیں۔ علاوہ ازیں "سیمی اپسٹریکٹ" میں رنگوں کی مکالمہ آرائی کے ساتھ ساتھ جدت، علامت اور سبجیکٹ کا ترفع نہایت دلکش پیرائیہ اظہار سے مصوری کو نمایاں طور پر ایک جداگانہ اسلوب عطا کرتا ہے۔

راجا نیئر بحیثیت شاعر، مصور، عکاس، کالم نویس اور براڈ کاسٹر خود کو ہمہ وقت مصروف رکھنے کی وجہ سے خود کو ہمہ جہت شخصیت کہلوانے کے لائق ہے۔ راجا نیئر کا یہ ادبی سفر اور فنونِ لطیفہ سے گہری وابستگی 30 سال کے عرصے پر محیط ہے اور اس میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔

راجا نیئر کی اُردو، پنجابی شاعری الگ تھلگ انداز، اسلوب اور کشش رکھتی ہے اور یہی انفرادیت اُس کی مصوری میں بھی ہر جگہ واضح طور پر جھلکتی ہے۔ اسی لیے تو راجا نیئر کہتا ہے کہ دورِ حاضر میں ادب اور مصوری ہر شخص پر منکشف نہیں ہوتی یہ خواص صرف اہل دل کے احاطہ ادراک میں ہی سما سکتے ہیں۔

جان دے دی تو کیا خسارا ہوا
عشق میں نام تو ہمارا ہوا
زندگی داؤ پر لگائی تھی
میں ہوں اپنی خوشی سے ہارا ہوا

ہجر نے کتنے روپ دھار لیے
پہلے آنسو تھا پھر ستارا ہوا
عام لوگوں پہ کیسے کھلتا میں
تھا کسی خاص کا پکارا ہوا
درد کو زندگی سمجھتا ہوں
یہ ہمیشہ مرا سہارا ہوا

زاہد محمود زاہدؔ

تیرے اس جبر سے انکار بھی ہو سکتا ہے
خوف کوئی پسِ دیوار بھی ہو سکتا ہے
غم نہ کر کوئی مددگار بھی ہو سکتا ہے
تیرا مطلوب طلبگار بھی ہو سکتا ہے
تو سمجھتا نہیں اے میرے گرفتارِ انا
دل کسی اور کا بیمار بھی ہو سکتا ہے
تم مرے سامنے شمشیر بدست آئے تو پھر
آئنہ سا کوئی دیوار بھی ہو سکتا ہے
سوچتا ہوں کبھی انکار بھی کر کے دیکھوں
دوسری سمت سے اصرار بھی ہو سکتا ہے
اُس نے جاتے ہوئے ہرگز نہیں سوچا ہوگا
جب وہ پلٹے گا تو انکار بھی ہو سکتا ہے
دیکھنا تم جسے بے مایہ سمجھ بیٹھے ہو
کل کو وہ صاحب دستار بھی ہو سکتا ہے
چاند شاخوں میں اُلجھتا ہوا دیکھا تو کھلا
کوئی آنکھوں میں گرفتار بھی ہو سکتا ہے
جس کو تم صرف سمجھ بیٹھے ہو خواہش میری
سوچ لو یہ میرا معیار بھی ہو سکتا ہے
بات کرتے ہوئے اے آنکھ ملانے والے
کبھی زاہدؔ سے تمہیں پیار بھی ہو سکتا ہے

انتقام

سعدیہ بتول/راولپنڈی

آج پھر پرنسپل صاحبہ کا پارا ہائی تھا اور تمام ملازمین سر جھکائے ان کی گرج برس کو سہہ رہے تھے۔وہ دل کی بری نہیں تھیں غریبوں کی مدد امداد میں بھی پیش پیش رہتی تھیں لیکن اصول پر سمجھوتا کرنا انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

''رضیہ!!تمہیں آج تک کبھی تنخواہ کم ملی یا ادائیگی میں دیر سویر ہوئی؟تنخواہ کے علاوہ بھی عید بقر عید پہ حسب توفیق کچھ نہ کچھ دیتی ہی رہتی ہوں۔قرض مانگو تو وہ تیار چھٹی کی ضرورت ہو تو وہ بھی مل جاتی ہے پھر اس قدر لاپروائی کیوں؟''

''معاف کر دیں جی آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔''رضیہ منمنائی۔

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تم یہاں صفائی کیلئے آتی ہو اور کام سے بے اعتنائی مجھے پسند نہیں ہے۔آئندہ مجھے سکول کا کوئی کونہ بھی گندہ نظر آیا تو یاد رکھنا مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

''ہنہ!وہ تو اب بھی نہیں ہے۔''شمع نے منہ بنا کر نیچی آواز میں کہا۔رضیہ نے اسے زور سے ٹھوکا دیا تو شریری مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں ناچنے لگی۔

''اب دفع ہو جاؤ سب کے سب اور شمع تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ اتنے کھلے گلے مت پہنا کرو۔''شمع کوئی بھی جواب دیئے بنا باہر نکل گئی اور باقی سب نے بھی طویل سیشن کے خاتمے پر سکون کا سانس لیتے ہوئے اس کے پیچھے قدم بڑھائے۔

باقی سب لوگ تو پرنسپل صاحبہ کے مزاج سے آشنا ہو چکے تھے اور ان کی بری بھلی خاموشی سے سن کر بھلا دیتے تھے۔دراصل وہ سب جانتے تھے کہ اچھی ملازمت اور اتنے دینے دلانے والے مالک کہاں ملتے ہیں۔وہ کیا کہتے ہیں کہ دودھ دینے والی بھینس کی دولاتیں بھی بھلی۔تمام اسٹاف اس قسم کی تاویلیں دے کر ڈانٹ کو ہنسی میں اڑا دیتا تھا لیکن شمع کی صورت حال یکسر مختلف تھی۔وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی رہتی۔

''دیکھ شمع آج پھر پرنسپل صاحبہ نے تیرے کپڑوں پر اعتراض کیا ہے یہ نہ ہو اسی بات پہ تجھے نوکری سے نکال دیں۔میری مان تو یہ بے ڈھنگے فیشن چھوڑ دے۔''

''ہنہ پرنسپل صاحبہ نے کہا اور میں نے چھوڑ دیا یہ تو ممکن ہی نہیں۔بڑی آئی روک ٹوک کرنے والی۔خود تو موٹی اور ٹھگنی ہے ہزاروں کے سوٹ پہن کے اور پالروں میں گھنٹوں صرف کر کے جب رتی برابر فرق نہیں پڑتا تو ہم پہ غصہ اتارتی ہے۔''

''اچھا تیری مرضی میں تو تیرے بھلے کا کہتی ہوں۔''رضیہ بات ختم کرتے ہوئے فرش پہ پوچا لگانے کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی اور شمع اپنے ماتھے پہ آئی ہوئی لٹ کو بل دیتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔پرنسپل صاحبہ کی کافی کا ٹائم ہو رہا تھا۔

شمع!!وہ پرنسپل صاحبہ کی میز پر کافی رکھ کر مڑنے لگی تو ان کی پکار نے اس کے قدم روک لیے۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اسکول کی ملازمت چھوڑ کر میرے گھر کا کچن سنبھال لو۔''''لیکن آپ کے ہاں تو ماسی رحیماں آتی ہے نا۔''''آتی تھی لیکن اب وہ بیمار رہنے کی وجہ سے کام چھوڑ گئی ہے۔میں سارا دن اسکول میں ہوتی ہوں اور یہاں سے جا کر اس قدر تھک جاتی ہوں کہ کوئی کام نہیں کر سکتی۔''ان کی ملتجی نگاہیں سوالیہ انداز میں شمع پہ ٹکی تھیں۔

''ٹھیک ہے پرنسپل صاحبہ ہم غریبوں نے تو کام ہی کرنا ہے یہاں نہ سہی وہاں سہی،پر آپ کا گھر مجھے بہت دور پڑتا ہے آنے جانے میں مشکل ہوگی۔''شمع نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔

''اس بات کی تم فکر نہ کرو میں تمہیں آنے جانے کا کرایہ الگ سے دوں گی۔کھانا جو بچے لے جایا کرنا سردی گرمی کے کپڑے میں بنوا دیا کروں گی۔''

''بہت شکریہ جی میں پھر کل صبح سے آپ کے گھر آجاؤں۔''

''ہاں ٹھیک ہے یوں بھی کل اتوار ہے میں بھی گھر میں موجود ہوں گی تمہیں کام سمجھا دوں گی۔''

شمع کے ہامی بھرنے سے طلعت بیگم مطمئن ہوگئیں۔وہ جانتی تھیں کہ نئے ملازموں کو رکھنا اور کام سمجھانا کس قدر دق کر دینے والا مرحلہ ہوتا ہے اور شمع تو دو سال سے سکول کا کچن سنبھالے ہوئے تھی۔صحت مند اور چست تھی ہر کام جلدی جلدی نپٹا لیتی تھی اور ان کے مزاج کو بھی سمجھتی تھی۔

اگلے روز صبح ساڑھے آٹھ بجے شمع طلعت بیگم کے روبرو تھی۔اس نے بہت جلد سارا کام سمجھ لیا

۔طلعت بیگم نے کچھ دن تو اس کی نگرانی کی لیکن جلد ہی اس کی کارکردگی سے متاثر ہو کر بے فکر ہو گئیں۔

شمع صبح آٹھ بجے طلعت بیگم کے گھر پہنچتی تو وہ ناشتہ کر کے سکول جا چکی ہوتیں۔وہ جلدی سے صاحب کا ناشتہ بنا کر میز پہ لگاتی۔ان کے چھوٹے بھائی جودت نے اگر یونیورسٹی جانا ہوتو وہ بھی ساتھ ہی ناشتہ کر کے نکل جاتا ورنہ تمام دن پڑا سوتا رہتا۔شمع کے ذمے کھانا بنانے کے علاوہ گھر کی صفائی اور کپڑے استری کرنے کا کام بھی تھا۔تمام دن گھر پہ اسی کا راج ہوتا جلدی سے کام ختم کر کے ٹی وی دیکھتی رہتی۔اسے نت نئے کپڑے پہننے اور بننے سنورنے کا بہت شوق تھا۔جب سب لوگ چلے جاتے تو طلعت کے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر نت نئے بالوں کے انداز بنانے میں اسے خوب مزا آتا۔چونکہ یہاں کام کم اور پیسے زیادہ مل جاتے تھے اور طلعت اس کے شوق کو جانتے ہوئے اسے اپنے پرانے کپڑے اور میک کا سامان بھی دے دیا کرتی تھیں اس لیے وہ خوب جی لگا کر سارے کام کرتی۔چند دنوں میں ہی اس نے گھر کو نک سک سے درست کر دیا تھا۔بوڑھی ماسی رحیماں کے ہاتھوں میں اتنا دم کہاں تھا۔طلعت بیگم تو اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھیں۔

شمع!!چائے لے آؤ بھئی۔

اس روز اتوار تھا اور طلعت گھر پر تھیں ان کی خالہ زاد مسرت ان سے ملنے آئی تھیں اور خوب محفل جمی ہوئی تھی۔ابھی وہ آواز دے کر مڑی ہی تھیں کہ شمع چائے کی ٹرالی دھکیلتی ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔چائے کے ساتھ گھر کے بنے شامی کباب ،پکوڑے اور تازہ بیک کیا ہوا کیک بھی تھا۔طلعت کا تو دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔

دیکھا مسرت میں کچھ غلط کہتی تھی بھئی سچ پوچھو تو مجھے تو شمع کے روپ میں بیٹی مل گئی ہے۔اس نے تو مجھے اور میرے گھر کو ایسا سنبھالا ہے کہ میں ہر فکر سے آزاد ہو گئی ہوں۔''

جتنی دیر میں شمع نے چیزیں میز پر لگائیں طلعت اس کے ہاتھ کے ذائقے اور سگھڑاپے کی تو صیف میں رطب اللسان رہیں اور مسرت حیران پریشان انہیں دیکھے گئیں۔

''طلعت برا مت مانیں تو ایک بات کہوں؟''

''کہو بھئی ایسی کیا بات ہو گئی کہ تمہیں اجازت کی ضرورت پڑ گئی طلعت نے کیک کا پیس ان کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔''

''ناراض مت ہونا تم نے اس لڑکی کو بہت ہی چھوٹ دے رکھی ہے۔اس کا یہ بنا سنورا حلیہ دیکھو کیا ایسی ہوتی ہیں کام والیاں۔''

''ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے جہاں تک اس کے فیشن کرنے کا شوق ہے تو پہلے مجھے بھی اس پر اعتراض تھا لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ یہ ایک بے ضرر سا شوق ہے سارا دن کاموں میں لگی رہتی ہے اس لیے مجھے بھی ٹوکنا اچھا نہیں لگتا۔سچ پوچھو تو بھئی مجھے تو گندے سندے رہنے والی ماسیوں سے الجھن ہوتی ہے۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن تمہارے گھر میں دو مرد بھی ہیں۔خود تم سارا دن گھر سے باہر ہوتی ہو۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا زیدی صاحب کی عمر ہے ان باتوں کی ویسے بھی وہ اسے بیٹی سمجھتے ہیں اور اس کی بھولی باتوں پہ ہنستے رہتے ہیں اور جودت بھلا کہاں گھر نکلتا ہے یونیورسٹی سے آتا ہے تو دوستوں کے ساتھ نکل کھڑا ہوتا ہے۔''

''اچھا بھئی آپ جیتیں ہم ہارے نہیں کچھ کہتے آپ کی شمع کو۔''

یوں ہنسی ہنسی میں بات آئی گئی ہو گئی۔مسرت کی باتوں نے طلعت کے ذہن میں ہلکی سی پریشانی کی لہر پیدا کی لیکن پھر انہیں یاد آیا کہ کیسے خالو ابا سے ضد کر کے زیدی نے ان سے رشتہ طے کیا تھا حالانکہ خالو ابا اپنی بھتیجی کو بہو بنانا چاہتے تھے۔پھر شادی کے بعد بھی اب تک خاندان میں انہیں چاند سورج کی جوڑی کہا جاتا تھا۔مالی لحاظ سے بھی طلعت کو برتری حاصل تھی اس کے اسکول سے اچھی خاصی آمدن ہو جاتی تھی ۔زیدی صاحب اگر چہ کامیاب بزنس مین بن گئے تھے لیکن انہیں بزنس کیلئے سرمایہ بھی تو سسرال کی طرف سے سلامی میں ملا تھا ورنہ وہ تو اتنے پڑھے لکھے بھی نہ تھے کہ کوئی ڈھنگ کی نوکری انہیں مل سکتی۔یہ سب سوچنے کے بعد ایک تفاخر سے انہوں نے اپنے منفی خیالات کو جھٹک دیا اور اپنے معمولات میں مشغول ہو گئیں۔

ایک روز شمع کے جی میں کیا سمائی کہ طلعت کی الماری ٹھیک کرتے ہوئے اس کا نیا سوٹ نکال کر پہن بیٹھی ۔آئینے کے سامنے اپنا آپ اتنا اچھا لگا کہ بدلنے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔گہرا سبز رنگ اس پہ بہت کھل رہا تھا۔سنگھار میز پہ پڑے میچنگ بندے کانوں میں ڈال کر ہلکا سا میک اپ بھی کر ڈالا۔وہ اپنی پرستش میں اتنی محو تھی کہ اسے احساس تک نہ ہوا کہ جودت کب سے کھڑا اسے تکے جا رہا ہے اس کے پکارنے پہ وہ پیچھے مڑی تو بوکھلا گئی جودت مسلسل ہنسے جا رہا تھا اور

اسے تنگ کیے جارہا تھا کہ میں نے تمہاری تصویر لے لی ہے اور میں اسے بھابی کو دکھاؤں گا۔وہ اس سے موبائل چھیننے کی کوشش کرنے لگی۔

شمع!!!!!!!!!!طلعت کی آواز گونجتی ہی چلی گئی اور شمع اور جودت تو جیسے دم بخود رہ گئے۔

طلعت غیض سے تھرا رہی تھیں۔انہوں نے روتی صفائیاں پیش کرتی شمع کو بے نقط سنائیں اور کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیا۔جودت نے سمجھانے کی کوشش کی کہ جیسا آپ سمجھ رہی ہیں ایسا کچھ نہیں ہے یہ سب اتفاق تھا تو ان کے جلال نے جودت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''وہ دن بھول گئے جب خالہ امی کی وفات کے بعد تمہیں ماں کی طرح پالا بہنوں کی شادیاں کیں اور تم ایک کام والی کی طرف داری کرنے کیلئے میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔''

چند ہی دنوں میں جودت کی نوکری لگی تو انہوں نے ایک خوبصورت لڑکی سے اس کی شادی کر دی وہ اپنی بیوی کو لے کر الگ ہو گیا تو گھر کی خاموشی کاٹ کھانے کو دوڑنے لگی۔طلعت کی ایک ہی بیٹی تھی جو اپنے شوہر کے ساتھ آسٹریلیا میں مقیم تھی۔

گھر کی خاموشی اور بے ترتیبی نے زیدی صاحب کے جی کو اچاٹ سا کر دیا تھا۔کوئی کام وقت پر نہ ہو پاتا نہ ہی کوئی چیز جگہ پر ملتی۔طلعت کو تو سکول سے فرصت نہ تھی اور کام والی جو بھی ملتی اس کے کام میں شمع والی بات نہ ہوتی تھی۔زیدی صاحب طلعت سے شکایت کرتے تو وہ الٹا ان سے بگڑ جاتیں۔

''کیا کروں گھر بیٹھ جاؤں اور برسوں کی محنت سے چلایا ہوا کام چولہے میں جھونک دوں۔آپ کی اللہ اللہ کرنے کی عمر ہے گھر کے بکھیڑوں کو چھوڑیے وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائیں گے۔''

اس بدمزگی سے بچنے کیلئے زیدی صاحب گھر پہ کم وقت گزارتے اپنے پرانے دوستوں کیساتھ شطرنج کی بازیاں لگتیں تو کبھی گپ شپ کی محفل جمتی طلعت بیگم مطمئن تھیں کہ ان کا دھیان بٹ گیا ہے۔وہ اپنے سکول کے بکھیڑوں اور سوشل سرکل میں مصروف ہو گئیں اور وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے سرکتا گیا۔ایک روز وہ چائے پی رہی تھیں کہ موبائل کی گھنٹی بجی انہوں نے فون کان سے لگایا تو ایک مرد اور عورت زور و شور سے گفتگو میں مشغول تھے اور غالباً غلطی سے کال مل گئی تھی۔

''میں کہتی ہوں آپ کب اپنی صدر والی دکانیں میرے نام کریں گے؟اور آپ کیا سمجھ رہے ہیں کیا یہ سب میں اپنے لیے مانگ رہی ہوں۔اشعر ابھی دو ماہ کا ہے آپ نے اس کیلئے کچھ سوچا ہے؟''

''ارے جو کہو گی ہو جائیگا بس تم ناراض نہ ہو تم تو جانتی ہو کہ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن تمہاری بے اعتنائی برداشت نہیں ہوتی اور اشعر اس میں تو میری جان ہے۔بیٹے کا باپ بن کر اپنا آپ پھر سے جوان لگنے لگا ہے۔''فون سے آنے والی زیدی صاحب اور شمع کے قہقہوں کی آوازوں نے تو جیسے طلعت بیگم کے حواس ہی معطل کر دیئے۔فون ان کے ہاتھ سے گر کر کرچی کرچی ہو گیا۔

عدیل احمد آسی/ڈنمارک

نہ روح اپنی علیل کر تو
کہ رب کو اپنا وکیل کر تو
وہی ہے منصف وہی ہے عادل
اسی کے آگے اپیل کر تو
سکون چاہے جو زندگی میں
تو خواہشوں کو قلیل کر تو
اگر خدا نے دیا ہے منصب
تو مت کسی کو ذلیل کر تو
فضول باتیں سنا نہ ہم کو
کہ پیش اپنی دلیل کر تو
ہمیں خبر ہے کہ ہیں پرانے
دکھا نہ زخموں کو چھیل کر تو
خدا سے آسی تو ڈر ہمیشہ
انا کو اپنی ذلیل کر تو

....

ہے ایک بستی کہیں شہرِ خواب سے آگے
جواب کیا ہو کہ ہے لاجواب سے آگے
یہ بے سبب تو نہیں ہے مرا دوانہ پن
کچھ اور بھی ہے تمہارے شباب سے آگے
ذرا سی دیر یہاں سطحِ آب پر ہوں میں
یہ زندگی ہے مری کیا حباب سے آگے
ڈرا رہے ہیں ادھر مجھ کو روزِ محشر سے
ادھر میں سوچ رہا ہوں حساب سے آگے
اسی لیے تو وہ سربجود رہتی ہے
کہ دیکھا کرتی ہے تتلی گلاب سے آگے
تمہارے نام سے منسوب زیست کر دی ہے
خیال آتا ہے اب انتساب سے آگے
اسے کتاب سمجھ کر میں پڑھ رہا تھا مگر
وہ شخص نکلا ہے آسی کتاب سے آگے

یک بوسۂ جاں/ سیّد تحسین گیلانی/ بورے والا

سیّدہ آیت (سیدہ راحیلہ شیرازی)/ وائے نصیبا/ ساہیوال

میں ایک جھلک کا شیدائی کروڑ صدیوں کے گلے ملا
لیکن جب میرے سامنے تصویرِ حیات کے لب کانپے،
عشق روبرو ہوا تو یوں لگا سورج موم کو چھونے کا تمنائی۔
ہو میں دستِ محبت پر بوسے کے لیے جھکا تو معلوم ہوا
وہ موم نہیں آگ کا بوسہ تھا سورج اپنے آپ میں شرمایا
وہ بعیتِ عشق کے لیے سربسجود ہوا لیکن وہاں تو کوئی
نہیں تھا میں نے خود کو خود کے روبرو خود کو ہمکلام پایا
میرے اندر حیرانیوں نے انگڑائیاں لیں اپنے وجود کا
دیدار بھی کتنا حسین ہوتا ہے ہائے یہ بھلا سب کو کہاں
نصیب ہوتا ہے۔
وقت کا وہ ٹکڑا مجھے اپنے ساتھ لے جانا تھا وہ ٹکڑا جس
میں عشق قید تھا وہ لمحہ کتنا جاں گسل تھا جو جدائی کا بگل
بج رہا تھا۔ ہم نے ایک ہوتے ہوئے وقت کی منت
سماجت کی کہ ہمیں ایک رہنے دے لیکن آسمان اور
زمین کو الگ رہ کر ایک رہنے کا حکم ملا۔۔۔
محبت نے اپنی آنکھیں ہمیں تحفہ کیں۔
فرشتوں نے اپنے پر عطا کیے۔۔
خیال نے لفظ کاسے میں ڈالے۔۔
میں پیچھے ہٹا اور نعرہ مستانہ لگایا۔۔۔
یہ سب دیتے ہو
مجھے جو دینا ہے اُس سے دور رہنے کا حکم دیتے ہو۔۔۔
ایک آنکھ میرے اندر گھس گئی
وہ مجھ میں کھل گئی یعنی بینائی مل گئی۔۔
تابعداری
ہم حکم بجالائے۔۔
بس ہم ایک بوسہ شیریں چرا لائے۔۔۔
ہم روئے تو خدا مسکرایا۔۔۔
آسمان پر محبت کا ستارہ چمکنے لگا۔۔۔

عورت
سرخ عنابی ایک بدن
ایک خیال کے غار میں قید
صدیوں کی رسی میں جکڑا
ہانپ رہا ہے
کانپ رہا ہے

....

ہالہ نورِ خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔۔۔ ہالہ کو بار بار نظم دہراتے سن کر نینی نے کروٹ بدلی اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔۔۔۔۔۔۔ سرخ آنکھوں کے ڈوروں میں منجمد ضبط اندر کی وحشت اور آتش کا مظہر تھا۔۔۔۔۔۔۔

"""تو مجھ سے عمر میں تو زیادہ چھوٹی نہیں لیکن تجربے میں یقیناً بہت چھوٹی ہے۔۔۔ اس لئے میری نصیحت پلو سے باندھ لو"

کیسی نصیحت آپا۔۔۔ ہالہ نے یکدم یوں پکارے جانے پر حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

بلاتمہید کہہ رہی ہوں تم اس بلا کے سائے سے بھی دور رہنا۔۔۔ یہ جیتے جی مار دیتی ہے۔۔۔۔ یہ جنگل کی چوتھی سمت ہے جو بھی اس طرف جاتا ہے بن موت مارا جاتا ہے۔

دل پہ نقش کر لو ہالہ نور۔۔۔۔۔ کہے دیتی ہوں محبت کا تجربہ مت کرنا۔۔۔ """

کیا کہہ رہی ہیں نینی آپا۔۔۔ محبت تو خود زیست کا کامیاب تجربہ ہے اس کے لئے کسی اور تجربے کی کیا ضرورت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہالہ نے مسکراتے ہوئے کہا مگر دوسرے ہی لمحے اپنی بہن کے چہرے کی ویرانی نے اسے تڑپا کر رکھ دیا۔۔ اس کے مسکراتے لب سکڑ گئے اور وہ آنسو پیتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کر نینی کے پاس آ بیٹھی۔۔۔

تو ابھی نہیں جانتی۔۔۔ میری شہزادی۔۔

کچھ جانتی ہی نہیں۔۔۔۔ نینی نے ہالہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔۔۔ جیسے وہ ننھی بچی ہو اور نینی کو اس کے بھیڑ میں کھو جانے کا خدشہ ہو۔۔۔

کیا ہے ایسا نینی آپا جو چھپا ہیا اور میں نہیں جانتی۔۔۔

تو ابھی سرخ رنگ میں رچی۔ سیاہی ڈھونڈنے سے قاصر ہے۔۔۔ ابھی تو تجھے یہ خبر نہیں کہ گھٹا کے دامن میں کیا قیامت انگڑائیاں لیتی ہے۔۔۔ تو نہیں جانتی کہ سرخ آیت کی وحی کیا ہے؟؟

"سرخ آیت۔۔۔۔؟؟؟"

ہاں۔۔۔ سرخ آیت۔۔۔ وہ آیت جو زبان بے زبانی سے صبر کی لوح پہ نقش ہوتی ہے اور پھر تقدیر کے لہو میں جذب ہو کر احساس کی شہ رگ پہ نازل ہوتی ہے۔۔ پلکیں جسے وجد میں چومتی ہیں اور نگاہیں خاموشی سے حفظ کرتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آنکھیں اذان - ورد میں جس کی تلاوت نہ کریں تو نماز۔ ہجر مکمل نہیں ہوتی۔۔۔ تو نہیں جانتی کہ جن کے حرم - دل کی دیواروں میں یہ آیت خاموشی سے

گونجتی ہے بیڑیاں ان کے پا؟ں کا مقدر اور قفل لبوں کا مقسوم بنتے ہیں۔۔۔۔

۔۔لفظ تھے یا اڈتا لاوا ۔۔روح کو جھلساتے ہوئے۔۔۔۔۔۔۔تڑپاتے ہوئے۔۔۔۔

قفل توڑ دینے چاہئیں۔۔۔۔۔۔۔نینی آپا

ہالہ نور نے نینی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔جہاں اداسی دھمال ڈالے آنکھوں کا رنگ بدل رہی تھی۔۔۔

دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ۔۔۔دھڑام۔۔۔کہیں کچھ ٹوٹ کر گرا تھا۔۔اندر بولنے والا ابھی تو یہی کہتا ہے۔۔مگر ہالہ کو کس نے بتایا؟؟ اففف کیا وہ اتنا اونچا بولنے لگا ہے؟؟؟ دل اور خون کی گردش ایکدم تیز ہوئی تھی۔

قفل توڑ دینے چاہئیں۔۔۔۔۔نینی نے استعجابیہ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے سر ہلایا۔۔۔

ہاں نینی آپی۔۔۔۔لہجے میں اعتماد پہلے سے بھی زیادہ تھا۔۔۔

اور پھر جیسے قفل ٹوٹ گئے تھے۔۔۔لیکن صرف آواز کے جہاں پچھلے کئی برسوں سے چپ تالا بنی پہرہ دیتی رہی تھی۔۔۔

تو تو دیوانی ہے۔۔۔۔ جسے بس اپنی دھن میں بولنے سے غرض ہے۔۔۔کانپتا ہاتھ ہالہ نور کیلبوں پر رکھ کر وہ پھٹ ہی تو پڑی تھی۔۔

اسے خبر ہی نہیں انجانے میں یہ کیا کہہ گئی ہے۔۔ایک نیزہ نینی کے دل میں پیوست ہوا تھا۔۔۔

اک ٹھنڈی آہ نے گرم سینے سے پھڑ پھڑا کر اڑان بھری۔۔۔یاد کے نوکیلے پروں کی خراش اس نے جلتے رخساروں پر محسوس کی۔۔۔

تو اور کیا۔۔۔۔؟؟

کچھ غلط تو نہیں کہا۔۔گھٹ گھٹ کر مرنے سے تو بہتر ہے جینے کی کوشش کر لی جائے۔۔اس کی بدلتی رنگت دیکھ کر ہالہ کا دل تڑپ اٹھا؟؟

ہائے یہ کیسا سونے سا سنہرا روپ سرسوں ہوتا جاتا تھا۔۔۔۔کیا یہ بھی مر جائے گی۔۔۔؟؟؟

ایک وسوسہ دل میں ابھرا تو کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

ہالہ نے نظر پھیر قطعی لہجے میں کہا۔

"پندرہ سال بہت ہوتے ہیں نینی آپا۔۔اتنے عرصے بعد تو کنجی کا کام زنگ ہی کر دیتا ہے۔۔۔"

کہنا بہت آسان ہوتا "پگلی" مگر یہ سب کرنا بہت مشکل۔۔

کیوں کیا مشکل ہے؟؟؟۔۔۔۔قفس کی دیواروں سے سمجھوتہ بزدلی ہے۔۔۔نینی آپا آزادی قیمت مانگتی ہے۔۔بازار دنیا میں قسمت والے ہی اس جنس کے خریدار بنتے ہیں۔۔ہم سے مفلس تو نام لے کر مجرم ٹھہرتے ہیں۔۔خریدنے کی ہماری اوقات کہاں۔۔۔۔۔۔ صدیاں قیمت کا قرض چکاتے دم توڑ دیتی ہیں۔۔۔سانسیں گروی بھی رکھ دی جائیں تو سود اصل پہ بھاری رہتا ہے۔۔۔۔

بہت سی نادیدہ زنجیریں اس کے آس پاس چھنکی تھیں۔۔۔بولتے بولتے آواز بھرا گئی تھی۔

قرض چکانا تاوان میں آنکھیں دینے سے تو کئی درجے بہتر ہے نا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہالہ بھی شاید آج ارادہ کر کے مقابل آئی تھی۔

ایسے نہیں ہوتا۔۔۔ہالہ نور

جرات ہونی چاہیے۔۔۔۔

ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔۔نینی آپا

بات جرات سے نہیں قسمت سے بنتی ہے۔۔۔سکینہ خالہ کی مہرو کو بھول گئی ہو۔۔۔کیا جرم تھا کہ دن چمکتے اجالے میں ہنستی کھیلتی اچانک رات کے اندھیرے میں چپ چاپ دفنا دی گئی اور ماں کو ایک بین کی اجازت بھی نہ ملی۔کیا جرم تھا اس کا؟؟؟

اپنے حصے کے آسمان پر پرواز کی کومل سی تمنا اپنے حصے کی زمین پر آپ جینے کی خواہش۔۔۔۔۔۔

آبلہ پھوٹ رہا تھا۔۔۔ یہاں جینے کا اذن ہی تو نہیں ملتا۔۔۔

ایک سرد آہ سینے کا پنجرہ توڑ کر نکلی تو میں نے نینی آپا کے ہاتھوں کو دھیرے سے تھام کر انہیں سینے سے لگا لیا۔۔

آپا!!!۔۔۔۔۔لہجہ ہچکیاں لینے لگا۔۔کوشش تو کی جا سکتی نا۔۔۔

"پگلی"۔۔۔کیسے سمجھا؟ں تمھیں۔۔۔

قیمت بہت بڑی ہے۔۔۔۔لیکن اصل خوف ادائیگی کا نہیں وصولی کا ہے۔۔۔بات تو یہ کہ قیمت چکا کے بھی سودا ہاتھ آتا ہے یا خسارہ۔۔۔۔کسے اعتبار؟؟؟

نینی آپا!!! کئی جنگیں ہار جیت کی پروا کیے بغیر بھی لڑی جاتی ہیں۔۔۔صرف اپنے حوصلوں کی بقا کے لئے کیونکہ جب تک لشکر تیغ کی دھار پر ننگِ پا سینہ سپر رہتا ہے، جذب؟ بقا مورچہ باندھے جواں رہتا ہے۔۔

ایسی ہی جنگ آپ کو بھی لڑنا ہے۔۔۔اپنی بقا کے لئے اٹھیں اور اپنی خوشیوں کے لئے ڈٹ جائیں

اپنے لفظوں سے اس کے مردہ تن میں روح پھونکنے کی کوشش کرتے ہوئے ہالہ نے کہا۔۔

ہالہ نور تھی بھی ایسی۔۔۔نینی کے برعکس جو کہہ دیتی اس پر ڈٹ جانے والی۔۔۔

سب سے پہلا مرحلہ ننی آپا کو بیدار کرنے کا تھا جس میں اپنی کامیابی کا یقین ہو چلا تھا۔۔۔اب اسے اگلے مرحلے کو طے کرنا تھا۔اور پھر آنے والے دنوں میں ہالہ نور کی کوشش نے عزم کے بستر پر کتنی ہی کروٹیں بدل لیں مگر تمنا کی آنکھیں بے خواب ہی رہیں۔پہلے پہل تو ننی آپا کی کم عمری اور صبر کے قصیدے پڑھتے ہوئے اماں کو اس کی خاموش سسکیوں کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی رہی جن کے ماتھے کی تیوریاں شاہد تھیں کہ آواز پہنچ رہی ہے مگر اس کو سننے کے قابل نہیں سمجھتیں۔کتنا چاہا اس نے کہ ارمانوں کے نوحے کی آواز وہ سن لیں۔مگر پتھر پگھلنے لگیں تو پتھر کیسے کہلائیں۔۔۔اماں بھی سنی ان سنی کر دیتیں۔۔۔اس دن تو حد ہوگئی جب اس نے اماں سے دوٹوک بات کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے سختی سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ سوچ رہی ہے کبھی نہیں ہوسکتا۔۔۔ان کے ہاں ڈولی بھی جنازے کی طرح ایک ہی بار اٹھتی ہے۔

مگر اماں اس میں ان کا کیا دوش ہے۔۔۔ان پر تو دکھ کا پہاڑ ٹوٹا ہے۔۔سفید کفن سا جوڑا انہوں نے مرضی سے تو نہیں پہنا۔۔سلمان بھیا کی اچانک موت کے بعد ان پر زندگی کے دروازے بند تو نہیں کئے جاسکتے۔

ہم نے تو نہیں مارا سلیمان کو۔۔۔اللہ کی مرضی تھی اس نے اس کے نصیب میں یہی لکھا ہے تو ہم تم کون ہوتے ہیں دخل دینے والے۔۔اماں نے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے سختی سے جواب دیا۔۔

اماں یہ ظلم ہے۔۔۔۔آپ سب کی خواہش پہ آپا نے سر جھکایا اف تک نہیں کی۔۔۔اس کے باوجود کہ بچپن سے ہی خالہ بی ہادی بھیا کے لئے ننی آپا کی خواہشمند تھیں اور ہادی بھیا بھی یہی چاہتے تھے۔اماں خالہ بی اب بھی پورے مان سے ننی آپا کو بیاہنے پر تیار ہیں تو اس میں کیا برائی ہے۔۔اماں آپ بیٹی کے حق میں کیوں نہیں بولتی ہیں۔۔۔ کیسی ماں ہیں آپ۔۔۔۔۔چٹاخ۔۔۔جس ماں نے بچپن سے آج تک سخت ہاتھوں سے چھوا نہیں تھا آج اسی ماں کا ہاتھ اٹھا تھا۔۔۔دل دکھ، اذیت، بے یقینی اور بے اعتباری کی بھٹی میں جا گرا تھا۔۔۔

خبردار!!

اس کے آگے ایک لفظ بھی زبان سے نکلا۔زبان کھینچ لوں گی تمھاری۔۔روز روز اس کی ڈولی اٹھانے ہی کا کام نہیں رہ گیا ہمیں۔تمھارے باوا کے کانوں میں تمھاری بیہودہ باتوں کی بھنک بھی پڑی تو دونوں کی جان لے لیں گے۔۔۔آئی سمجھ۔۔۔۔۔۔۔دیدوں سے شرم حیا رخصت ہوگئی یا کوئی اور معاملہ ہے جو ماں سے یہ بات کرنے کی جرات آگئی۔۔۔اماں نے ایکدم پینترا بدلا تو ان کے لہجے میں قہر اور آنکھوں میں خون ایک ساتھ اتر آیا۔جبکہ اسے یوں لگا جیسے روح کے بدن کو کسی نے آری سے چیرا ہو۔۔۔وہ پلٹی اور شکست خوردہ قدموں سے کمرے میں چلی آئی۔۔۔جہاں اپنے نصیب کی طرح مجبور ننی آپا بت بنے بیٹھی تھیں۔۔۔یقیناً سماعتوں میں سیاہ نصیبی کا قصہ تہمت عشق سمیت اتر چکا تھا۔۔۔نظریں ملیں تو آنکھوں میں منجمد بے بسی گویا بین کرنے لگی۔۔۔

یقین مانو ہالہ نور۔۔۔۔۔اسی خسارے سے بچنے کے لئے پور پور قفل زدہ کیا تھا۔۔۔۔۔مگر قسمت کی سیاہی کہاں جاتی۔۔افسوس کہ خسارہ آج بھی پھر پھرا کر میرے ہی دامن میں پناہ گزیں ہو گیا۔۔۔کمرے میں بے بسی مرغ بسمل کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔اور باہر رات کی گہری تاریکی۔۔۔

وہ رونا نہیں چاہتی تھی مگر ضبط کے باوجود ایک آنسو نجانے کیسے آنکھ سے بغاوت کر کے رخسار پہ آٹھہرا۔۔۔

بیچارا۔۔۔ادھورے سفر میں مارا گیا۔۔نہ پلکوں کی چلمن نصیب ہوئی اور نہ کسی کا دامن۔۔۔

بالکل۔۔۔۔ننی آپا کی طرح

✧✧✧

راؤ وحید اسد

شجر اچھا نہیں لگتا ہوا اچھی نہیں لگتی
تمہارے بعد کوئی بھی دعا اچھی نہیں لگتی
میں ایسا گنگ لہجہ ہوں جسے پر شور دنیا میں
مرے ہونٹوں پہ کوئی بھی صدا اچھی نہیں لگتی
تری چہکار ایسی تھی تری مہکار ایسی تھی
کسی بھی پھول کھلنے کی ادا اچھی نہیں لگتی
مجھے کوئی بتائے تو یہ کس جنگل کی چڑیا ہے
نہیں صاحب نہیں مجھ کو وفا اچھی نہیں لگتی
مجھے تو اچھی لگتی ہے محبت کا گھڑا بھرتے
گھڑا بھرتے تجھے سوہنی بتا اچھی نہیں لگتی
شکایت ہے مجھے اس شہر کے بوڑھے درختوں سے
انہیں خوش بخت شاعر کی بقا اچھی نہیں لگتی

میٹھا زہر

ایم آر شاہد/لاہور

دور چنار کے پیڑوں پر شام کے سائے دن کے اُجالے کو چیرتے ہوئے کائنات پر پھیل رہے تھے۔ رات کا آنچل دھیرے دھیرے ہر شے پر خاموشی طاری کر رہا تھا۔ سردی بھی اب کافی عروج پر پہنچ کر اپنا آپ دکھا رہی تھی۔ پت جھڑ کی رُت نے باغوں میں ہریالی کی جگہ زردی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ درختوں سے خشک پتوں کے گرنے کی جھنکار خاموشی کے منہ پر پتھر برسا رہی تھی......!

گاؤں نصیب پور کی ایک پگڈنڈی پر گھرو دھرتی کا سینہ چیرنے والے کسان اپنے اپنے بیلوں کو ہانکتے ہوئے گھروں کی طرف چلے جا رہے تھے۔ مکانوں سے دھوئیں کے بادل فضا میں یوں گم ہو رہے ہیں جیسے آواز فضا میں غوطہ زن ہے۔ سورج بھی دور صنوبر کے پیڑوں کے پیچھے اب تھک ہار کر آخری ہچکی لے کر ڈوب چکا تھا لیکن آسمان پر ابھی تک ایک آدھا سرخی مائل بادلوں کا آوارہ ٹکڑا گردش کر رہا تھا۔

کونجوں کی ڈاریں اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھیں۔ قریب ہی چھپڑ کے کنارے ایک کیکر کے بنجر پیڑ پر اُلو اپنی بڑی بڑی مکار آنکھیں نکالے فضا کو گھور رہا تھا اور خزاں کی تباہ کاریوں پر مسکرا رہا تھا۔ گندم کی فصلیں پک کر ہر طرف سونا بکھیر رہی تھیں جنہیں دیکھ کر ہر کسان کی آنکھوں سے ایک شعلے کی چمک نمایاں تھی۔

دوسری پگڈنڈی پر بھکاریوں کا ایک گروہ غبار اُڑاتا ہوا ٹولہ گلوں میں بھیک مانگی ہوئی روٹیوں کے جھولے اور ہاتھوں میں کشکول لیے اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔ کتوں اور گدھوں کے بھونکنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ پچھلے دو سالوں سے سرکار نے گاؤں نصیب پور میں بجلی پہنچا کر نوجوانوں کے دلوں میں مستقبل کی روشنی کی کرنیں اُجاگر کر دی تھیں۔ بس گاؤں کا کوئی ایک آدھ مکان ایسا ہوگا جو بجلی کی نعمت سے محروم ہوگا۔

مگر چودھرانی ''ہاجراں'' کی حویلی میں بلبوں کی بجائے بڑے بڑے فانوس لٹک رہے تھے۔ حویلی میں ہر وقت نوکروں چاکروں کی چہل پہل رہتی اور روشنیاں اندھیروں کا پیچھا کرتیں۔ مگر اس حویلی میں پھر بھی اُداسیاں چھائی رہتیں۔ چونکہ چودھرانی اس حویلی میں اتنی وسیع اراضی کے وارث یعنی پوتے سے محروم تھی۔

اری او......لڑکی تم کیا ہر وقت اس ''روئی کے گڈے'' کو سینے سے لگائے رکھتی ہو۔ اگر تم ہمیں ہمارے گھر کی خوشیاں نہیں دے سکتی تو اس بے جان ''روئی کے گڈے'' کو ہماری جان کا روگ بنانے پر کیوں تلی ہو؟

شازیہ کی ساس ''ہاجراں'' نے اپنے ہونٹوں کو غصے سے زبان کے نیچے بھینچتے ہوئے کہا اور شازیہ کے ہاتھ سے ''روئی کا گڈا'' چھین کر مرغیوں کے ڈربے پر پھینک دیا اور کمرے میں چلی گئی۔

شازیہ اس طرح سہم گئی جس طرح کبوتر بلی کو دیکھ کر دم سادھ لیتا ہے۔ یہ بے بس کھڑی اس طرح دیکھتی رہی جیسے چوری کرتے ہوئے کوئی چور عین موقع پر پکڑا جاتا ہے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک لڑی رخساروں کو سیراب کرتے ہوئے دھرتی کے سینے میں اُتر گئی......!

چل، بڑی معصوم بن کر کھڑی ہوگئی ہو......اور گھر کا تمام کام کاج ویسے ہی پڑا ہے۔ ایک تم ہو کہ بس تمہیں اپنی گڈیوں پٹولوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ اسے خاموش کھڑی دیکھ کر شازیہ کی ساس اور بھی غصے میں سیخ پر جلتے ہوئے کباب کی طرح ہوگئی۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ زہر کی طرح اس کے سینے میں اُتر رہا تھا۔ طنز کے تیر اس کے دل میں پیوست ہو رہے تھے۔ شازیہ کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے آسمان کی نیلی چھت کو یوں گھور رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو''اے دنیا کے خالق! تیرے پاس کیا کمی ہے اگر تو میری گود بھی ہری کر دے میں بھی اس دنیا میں سکھ کا سانس لے سکوں تو سب جانتا ہے کہ میرے اولاد نہ ہونے سے مجھے سارا دن جلی کٹی باتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں بے قصور ہوں۔''

اگر تو مجھے اولاد نہیں دے سکتا تو پھر مجھے موت دے دے اسے خوشی سے گلے لگا لوں گی۔ اس گھر میں اب میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے''ہاجراں'' کی غصے بھری آواز سن کر جلدی سے اس کی بیٹی آسما باہر آئی۔ شازیہ کو اس طرح سہمے دیکھ کر قریب جا کر کہنے لگی: ''بھابی! میں نے تمہیں ہزار مرتبہ کہا ہے کہ تو میرے بیٹے راجو کو گود لے لے اور پھر میں تمہیں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں۔ آخر ان گڈیوں اور پٹولوں سے کب

تک دل بہلاتی رہوگی؟''

دیکھو تو ماں کی باتوں کا برا مت منایا کر۔ یہ لے اپنے راجو کو...... آسمانے پانچ سال کا گورا چٹا راجو اپنی گود سے شازیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ آسما کے ان لفظوں میں پیار اور ہمدردی کی چمک تھی۔ اس سے پہلے شازیہ آگے بڑھ کر راجو کو اپنی بے قرار بانہوں میں لیتی ''ہاجراں'' نے بھوکی شیرنی کی طرح اپنے پنجوں میں چھین لیا اور کہنے لگی ''ہوش کے ناخن لو لڑکی۔ کیا تم پاگل ہوگئی ہو۔ آئندہ کبھی اپنی زبان سے ایسی بات مت کہنا۔ جس گود کو خدانے ہرا نہ کیا ہوا سے تم اپنی گود خالی کر کے کیسے ہرا کر سکتی ہو؟ اور پھر تمہیں معلوم ہے کہ کانٹوں بھری جھاڑیوں کو کبھی پھول نہیں لگتے۔ اگر بھول کر کبھی ایک آدھا موسمی پھل لگ بھی جائے تو ہاتھوں کو زخمی کر دیتا ہے۔ بس بے اولاد عورت بھی ایک کانٹوں بھری جھاڑی ہے۔ ایسی بنجر زمین سے کبھی پھل پھول یا سائے کی اُمید وابستہ کرنا حماقت کی نشانی ہے۔ سمجھی تم؟''

شازیہ پتھر بنی یہ الفاظ سن رہی تھی۔ اس کی زندگی کو لفظوں کے بھاری بھر پتھروں سے زخمی کیا جا رہا تھا۔ اس کی خالی گود کو نامرادی کے انگاروں سے داغدار کیا جا رہا تھا۔ اس کی بدقسمتی یہ کہ کھل کر رو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی شکایت کرتی بھی تو کس سے؟ ماں باپ تو بچپن میں ہی ایک المناک حادثے کا شکار ہوگئے تھے۔

بھائی بھاوج نے بیاہ کر کبھی خیر خبر نہ لی تھی۔ بھائی اگر کبھی کبھار ملنے کے لیے چلا آتا تو ''ہاجراں'' اس کے سامنے اپنی بہو شازیہ کی بڑی تعریفیں کرتی اور یہ کبھی ظاہر نہ کرتی کہ میں اس نامراد کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ شازیہ کی نند آسما ماں سے مخاطب تھی۔ مگر ماں بھابھی کوئی غیر تو نہیں ہماری اپنی ہے۔ میرے اور اس میں آپ کو کوئی فرق محسوس نہیں کرنا چاہیے۔

خدا کی مرضی کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔ وہ چاہے تو کانٹوں بھری جھاڑیوں سے پھل اور پھول پیدا کر سکتا ہے نہ چاہے تو گھنے پیڑوں کو ان نعمتوں سے دور رکھ سکتا ہے اور پھر میں اپنی خوشی سے راجو کو گود دے رہی ہوں۔ میرے میاں نے بھی اس کی اجازت دے دی ہے۔ میرے پاس تو دو بیٹے ہیں نا۔ اگر میں ایک بیٹا بھابھی کو دے دوں گی تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بیچاری تو بالکل اکیلی ہے اور ماں گستاخی معاف ان طعنوں سے بھابھی کی زندگی کو جہنم نہ بناؤ۔ یہ میری بھابھی ہی نہیں بلکہ گہری سہیلی بھی ہے اور مت بھول ماں آپ کی بیٹی اور میری چھوٹی بہن سلمٰی جو خود بے اولاد ہے مگر کیا اس نے آج تک اپنے بے اولاد ہونے کا احساس دلایا ہے یا پھر اس کے سسرال والوں نے کبھی اسے اولاد نہ ہونے کے لفظوں سے داغدار کیا ہے اور پھر تو کیسی ماں ہے؟

آپ کو تو اپنی سگی بیٹی سے سبق سیکھنا چاہیے جو خود ایک بنجر زمین کے ٹکڑے کی مانند ہے۔ آسمانے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور خاموش ہو رہی۔ تم پھر بہکی بہکی باتیں کرتی ہو لڑکی۔ اپنی بکواس بند کرو اور تمہیں کئی بار سمجھایا ہے کہ اس نامراد کی زیادہ ہمدردی جتانے کی کوشش مت کیا کر۔

اگر میری بیٹی کو خدانے اولاد نہیں دی تو اس میں میری بیٹی کا کیا قصور، مگر اس شازیہ نامراد نے میرے بیٹے سلیم کو تعویذ گنڈوں سے پاگل بنانے اور اپنی گود خالی رکھنے کی قسم کھائی ہے۔ تمہاری ہی کی ہوئی تعریفوں کے پیچھے لگ کر میں اسے بیاہ کر لائی تھی...... ورنہ؟ اس نے تو ہماری آنے والی نسل کو ہی بٹہ لگا دیا ہے۔

ہاجراں کی گرج دار آواز میں دنیا بھر کی نفرت اور حقارت بھری ہوئی تھی۔ اس میں جھوٹ بھی کیا ہے ماں......؟ بھابھی جیسی خوبصورت، خوب سیرت لڑکی آپ کو ملتی کہاں تھی؟ یہ بیچاری تو خود اس گناہ کی سزا بھگت رہی ہے جو اس نے کیا ہی نہیں۔

ماں یہ جھوٹ مت کہو کہ اس نے خود تعویذ گنڈوں سے اپنی گود اُجاڑ رکھی ہے۔ کوئی عورت یہ نہیں چاہتی کہ اس کے سونے آنگن میں بہار نہ آئے۔ شادی کے بعد ایک میاں بیوی کی سب سے بڑی خواہش ہی یہ ہوتی ہے کہ ان کے سونے آنگن میں جلدی سے ایک ننھا سا پھول کھلے۔ پھر اولاد کا نہ ہونا تو خدا کے اختیار میں ہے۔ وہ بے پرواہ ہے، چاہے تو صحرا میں پھول اُگا دے نہ چاہے تو بھرے گلشن کو طوفانوں کی زد میں لا دے۔ آسمانے آگے بڑھ کر شازیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے پلو سے صاف کیا۔ جو ندی نالوں کی طرح بہہ رہے تھے۔ اس سے شازیہ کے پورے جسم میں ایک کپکپی سی سرایت کر گئی۔ جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سے روشنی کی ایک کرن اندھیرے میں کمی واقع کر دیتی ہے اسی طرح آسما کے دو پیار بھرے لفظوں نے شازیہ کی ہمت بندھائی شازیہ کو جیسے ڈوبتے تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔

ہمدردی اور پیار کے ان بولوں نے رکے ہوئے صبر کے بند توڑ دیے۔ اس کی آنکھوں میں بن بادل برسات کی جھڑی لگ گئی۔ ہاں...... تم ٹھیک ہی کہتے ہو کہاں سے ملتی ہے ہمیں ایسی خوبصورت دلہن۔

جس نے دس سالوں سے ہمارے گھر کو اُداسیاں اور پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ جس نے ہمیں ہنستے کھیلتے بچوں کے بدلے گڈیاں پٹولے دیے۔ یہ تو وہ ناگن ہے جس کے ڈنگ کی زہر آنے والی نسل کو ختم کر گئی ہے۔ یہ قاتل ہے ہمارے ان ارمانوں کی جو ہم نے دلوں میں بسائے تھے۔ چودھری صاحب بھی پوتے کی آرزو دل میں لیے اس دنیا سے رُخصت ہو گئے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی پوتے کو اپنی گود میں کھلانے کی تمام آرزوئیں لے کر دنیا سے ایسے ہی چلی جاؤں گی۔ اب آخری بات کان کھول کر سن لو لڑکی میں نے بہت صبر کیا۔ اب مزید صبر کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں چند ہی دنوں میں سلیم کی دوسری شادی کر رہی ہوں۔

اب تمہارا دل چاہے تو اس گھر میں نوکرانی بن کر رہ سکتی ہو ورنہ میکے کی راہ لو۔

ہاجراں نے چھاتی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ شازیہ کو اپنے چاروں طرف آگ کے الاؤ روشن ہوتے دکھائی دیے۔ کیونکہ عورت دنیا کا ہر ظلم سہہ سکتی ہے مگر سوکن برداشت نہیں کر سکتی۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی پل بھر میں اس کی تمام حسرتیں اور اُمیدیں جل کر راکھ ہو جائیں گی۔ وہ نڈھال ہو کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کمرے میں چلی گئی۔

صبح ہوئی کچھ دیر کے لیے وہ حویلی کے اوپر والے چوبارے کی کھڑکی کھول کر باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ آزاد پنچھیوں کی چہچہاہٹ عجب رنگ بکھیر رہی تھی۔ دھوپ کی کرنوں نے دھند کو غائب کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک کونجوں کی ڈار گزری جسے دیکھ کر اسے اپنا ماضی یاد آ گیا۔ یہ چند لمحوں کے لیے یادوں کے دریچے کھول کر اپنے ماضی میں گم سی ہو گئی۔

سب سے پہلا سین بچپن کا اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ جب ماں باپ اس سے بہت پیار کرتے تھے اور یہ اپنی سکھیوں کے ساتھ گڈیوں پٹولوں میں مصروف رہتی۔ اس کے حکم پر ماں باپ سر تسلیم خم کرتے۔ غرض کہ ہر طرف خوشیوں کا دور دورہ تھا۔ پھر وقت نے پلٹا کھایا تو ماں باپ ایک المناک حادثے کا شکار ہو گئے۔ اس حادثے نے شازیہ کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب برپا کر دیا۔ جس کی سزا اسے ابھی تک مل رہی تھی۔ اس کے زخموں پر مرہم رکھنے والا کوئی ہمدرد نہ تھا۔ وہ اپنی یادوں میں ایسی گم ہوئی جیسے اندھیرے میں لوگ راستہ بھول جاتے ہیں......!ادھر

"ہاجراں" نے اسکو خالی گود کے طعنے دے دے کر اس کا جینا محال کر دیا تھا۔ ویسے بھی سہاگن کو خالی گود سانپ کی طرح ڈستی رہتی تھی۔ پھر اگر اسے اس بات کا بار بار احساس دلایا جائے تو اس کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انجانے میں سانپ ڈس جائے تو اس کی اتنی تکلیف نہیں ہوتی اور زہر اثر نہیں کرتا جتنا سانپ کو دیکھ کر اس کے خوف سے تکلیف ہوتی ہے۔

شازیہ کبھی کبھی آسما کے بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی اور خوب پیار کرتی۔ مگر سچ ہے کہ ادھار مانگے ہوئے تیل سے کب تک دیا جاتا ہے اور اس سے زندگی کا کتنا اندھیرا کم ہوتا ہے۔ گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر شازیہ یہ چھاتی سے لگائے ہوئے "روئی کے گڈے" بخت ور سے مخاطب تھی۔ جاؤ! منے تم بھی گلی کے بچوں کے ساتھ کھیل آؤ۔ وہ دیکھو بچے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔

نہیں جانا اچھا نہ جا! نہ رو میرے لعل ماں واری جائے میں تمہیں ابھی دودھ پلاتی ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے دودھ پیے اچھا...... چل! اب چپ ہو جاؤ ورنہ تیری ماں تجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ بھئی کسے چپ کرا رہی ہو کون روٹھ گیا ہے؟ کسے نہیں مناؤ گی تم ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔

شازیہ کا شوہر سلیم باہر سے کمرے میں داخل ہوئے مخاطب تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا جب سامنے نظر دوڑائی تو پنگوڑے میں لیٹے "روئی کے گڈے" جس کا نام بخت ور رکھا تھا شازیہ لوری دے رہی تھی۔ نہیں نہیں کچھ بھی تو نہیں بس یونہی باتیں کر رہی تھی۔ گھبراہٹ کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں شرم و حیا کی ایک چمک نمایاں تھی۔ پھر ہلکی سی مسکراہٹ نے سلیم کو خوش آمدید کہا۔ وہ کچھ دیر کے لیے سب کچھ بھول گئی۔ اچھا...... اب سمجھا کہ تم خود سے ہی باتیں کر رہی تھی۔ دیکھو شازیہ میں نے کئی بار منع کیا ہے کہ اتنا سوچا مت کرو میری جان...... پگلی تیری سوجھی ہوئی آنکھوں اور ہونٹوں پر خشک سکری آنسوؤں سے بنے ہوئے رخساروں رندی نالوں کے نشان بتا رہے ہیں کہ ضرور ماں نے کچھ کہا ہے۔

میری جان! میں نے بار ہا تمہیں سمجھیا ہے کہ ماں کی باتوں کو دل پر نہ لگایا کر۔ اگر تم چاہو تو اس گاؤں کو چھوڑ کر شہر منتقل ہو جائیں تا کہ تم خوش رہ سکو۔ نہیں...... نہیں سلیم کی آواز میں بھی ایک درد کی لہر نمایاں تھی۔ بس شازیہ تمہیں اُداس دیکھتا ہوں تو خود بھی اُداس اور بے آس ہو جاتا ہوں۔

شازیہ کوئی جواب دیے بغیر اُٹھ کر رسوئی میں روٹی لینے چلی گئی۔ شازیہ کے لیے یہ پت جھڑ کا موسم کوئی نیا نہیں تھا۔ اس کو تو موسم گل بھی خزاں رسیدہ لگتا تھا۔ بہاریں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ چاروں طرف غموں اور اُلجھنوں کے پہاڑ سر نکالے کھڑے تھے۔ ہر راستہ خاردار جھاڑیوں سے بھرا دکھائی دے رہا تھا۔ آخر کار اپنی بے گناہیوں کے آنسوؤں کو صاف کرتی ہوئی روٹی کی چنگیر اُٹھائے کمرے سے باہر آ گئی۔ رات کی کالی سیاہ چادر کائنات پر پھیل چکی تھی۔ وقفے وقفے سے گدھوں اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر دوسرے دن کا سورج دھیرے دھیرے چیل کی پیڑوں کے پیچھے سے اپنا سر نکال رہا تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں کھڑکی سے چھن چھن کر اندر کمرے میں صبح ہونے کا پیغام دے رہی تھیں۔ باہر فصلوں پر برف کی سفیدی ہریالی کو ایک عجیب سماں بخش رہی تھی۔ حرارت سے پگھل کر برف زمین کی آغوش میں قطروں کی صورت میں جذب ہو رہی تھی۔ دُھند بھی کرنوں کی آہٹ سے دور بھاگ رہی تھی۔

شازیہ! گھڑے میں مدانی ڈالے دودھ سے مکھن نکالنے میں مصروف تھی۔ حویلی میں لگے آم کے بڑے پیڑ پر کوے کے کائیں...... کائیں کی صدائیں مسلسل آ رہی تھیں۔ آسما نے شازیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ یوں لگتا ہے جیسے کوئی مہمان آنے والا ہے۔ ہاں...... آسما! سنا ہے کوا بولے تو مہمان کی آمد ہوتی ہے۔ میرا تو خیال ہے تمہارے میاں باہر سے آ رہے ہیں۔ دو سال ہو گئے ہیں اسے پاکستان سے گئے ہوئے۔ شازیہ اپنی نند آسما سے مخاطب تھی۔

مگر بھابھی...... یہ پیغام تمہارے لیے بھی خوشیوں کا پیغام بن سکتا ہے۔ میری بہن...... نہیں۔ سوکھے پیڑوں پر کبھی کوا کائیں کائیں نہیں کرتا۔ ہمیشہ پیڑوں پر بیٹھ کر آمد کا پیغام دیتا ہے یا مکان کے بنیرے پر۔ بنجر پیڑوں پر تو ہمیشہ الو اور گدھ ہی آ کر بیٹھتے ہیں۔ جو اُجاڑ اور ویرانی کی نشانی ہے۔ اب تو ہی بتا میرا اور اس کوے کا کیا واسطہ۔ شازیہ نے حسرت بھری نظریں نیچی کرتے ہوئے مدانی دودھ سے باہر نکالی اور ہاتھ پونچھ کر سامنے الماری میں رکھے ہوئے ''بخت آور'' کی طرف بڑھی اور جلدی سے اپنی چھاتی کے ساتھ لگائے ہوئے۔ میں صدقے جاؤں اپنے بیٹے کے میرے چاند کو تو بھوک لگی ہوئی ہے۔ پھر شازیہ کبھی اس کے ہاتھوں کو چومتی اور کبھی پاؤں کو سینے سے لگتی، کبھی ہونٹوں پر ہاتھ کی اُنگلی سے ہنسانے کی کوشش کرتی۔ آسما! یہ تمام منظر کھڑکی کی سلاخوں سے دیکھ رہی تھی اور چپکے سے ہاتھ میں ٹیلی گرام لیے کمرے میں آ داخل ہوئی۔ دیکھ شازیہ...... بھابھی تم سچ ہی کہتی تھی کہ کوا بولے تو مہمان آنے کا پیغام دیتا ہے۔

کل میرا خاوند جمیل باہر سے آ رہا ہے۔ بس پھر میں چند دنوں تک اپنے گھر واپس چلی جاؤں گی۔ شازیہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آسما کو مبارک باد دی اور کہا تم کتنی خوش نصیب ہو کہ پیار کرنے والا شوہر اور لاڈ کرنے والے سسرال ملے۔ ادھر میری زندگی بھی کیا ہے۔ سلگتا ہوا اک انگارہ۔ دوسرا میرا بخت آور مجھ سے نہیں بولتا۔ گڈے کو بستر پر لٹاتے ہوئے شازیہ کہہ رہی تھی۔

اب تو کچھ بول۔ دیکھ اگر تو نہیں بولے گا تو تیری ماں ہمیشہ تجھ سے ناراض ہو جائے گی اور منہ پھیر لے گی۔ ہاں ہاں بول نا...... شازیہ کی آنکھیں وحشت زدہ ہرنی کی طرح حیران و پریشان ہو گئیں۔ آنسوؤں کی یلغار نے ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کا پیچھا شروع کر دیا۔ دیکھ بخت آور میں تجھے پچھلے دس برسوں سے بلا رہی ہوں مگر تو نہیں بولتا خدا کے لیے میرا کوئی قصور تو بتا۔ آخر میں کب تک یونہی منتیں کرتی رہوں گی۔

شازیہ تم کہاں ہو......؟ شازیہ! کچھ سنا تم نے۔ ماں کل ہی میری دوسری شادی ماموں کی بیٹی زاہدہ سے کرا رہی ہے۔ سلیم پریشانی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ہاں میں نے سن لیں تمام باتیں۔ کوئی بات نہیں تم اپنی شادی کی تیاری کرو انشاء اللہ آپ مجھے ہر موڑ پر صابر پائیں گے۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا شازیہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ خدا کے لیے میری مدد کرو۔ یہ مذاق کا وقت نہیں بلکہ سوچنے کا وقت ہے۔ مجھے کوئی مشورہ دو ورنہ کل میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔

سنو جان تم میری وہ رازداں ہو جس پر آسمان بھی فخر کرتا ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کبھی وہ پیار نہیں دے سکا جو ایک خاوند اپنی بیوی کو دے سکتا ہے۔ اب تم خود ہی سوچو کہ اگر میری بیوی کے سامنے میرا بھید کھل گیا تو پھر میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ ہر عورت تم جیسی عظیم اور باوقار نہیں ہو سکتی۔

پھر کچھ دیر کے لیے سلیم اپنے ماضی میں لوٹ گیا جب اس کی پہلی شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ مگر یہ انتہا اپنے گزرے ہوئے وقت میں کی ہوئی غلطیوں پر آنسو بہا رہا تھا۔ آخر ماں باپ کی ضد کے آگے سر جھکانا پڑا۔ مرادوں کی وہ پہلی رات جسے لوگ سہاگ رات کا نام دیتے ہیں اس کے لیے

اُلجھنوں اور پریشانیوں کا پیغام لائی۔

مجھے ابھی تک پہلی رات کی وہ تمام باتیں یاد ہیں جو تم نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہی تھیں۔ میں نے کہا تھا شازیہ! دیکھ...... میں ایک زندہ لاش ہوں۔ افسوس کہ میں تمہیں ایک خاوند کی تمام تر رعنائیوں کا پیار نہیں دے پاؤں گا۔ میں اپنے شباب کو دوستوں کی گندی محفلوں میں ان کوٹھوں کی نذر کر چکا ہوں جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ جہاں ہر شام سودے بازی اور ہر رات عصمتوں کی دھجیاں اُڑائی جاتی ہیں۔ وہاں کی دل چوند روشنیوں نے میری آنکھوں کی بینائی ختم کر دی ہے۔ اب میں آنکھیں رکھتے ہوئے بھی ایک اندھا مسافر ہوں۔ جس کی منزل قریب اور عقل وفہم دور ہے۔

پھر تم نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی زندگی بھر ساتھ نبھانے اور رازداں رہنے کی قسمیں کھائیں۔ ہاں میں نے کہا تھا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ تم اپنی ایک الگ دنیا بسا لینا۔ شازیہ میری جان تم پر سو بار قربان ہو۔ تم نے فرحت جذبات سے کہا تھا کہ میرے سرتاج جو میرے مقدر میں لکھا تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔

پھر وہ پہلی رات کی صبح کا منظر جو میری نظروں میں عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ یہاں تحریر کرتے وقت مجھے کھیڑوں کے ماہ جب ہیر بیاہ کر آتی ہے اور وہ دعا کرتی ہے کہ یا اللہ میں رانجھے کی امانت ہوں میری حفاظت کرنا۔ ہیر کی دعا قبول ہوئی اور وہ دوسرے دن صبح سسرال والوں کو دکھانے کے لیے جھوٹ موٹ کا نشان کرتی ہے۔ تو اسے یاد آتا ہے وہی کیفیت کچھ یہاں بھی شازیہ کے لافانی کردار میں جھلکتی ہے۔

ہیر کے غسل کرنے پر جو اشعار پیر وارث شاہ نے کتاب ہیر میں تحریر کیے ہیں ان کا نمونہ پیش خدمت ہے۔

فجر ہوئی تے اٹھ کے ہیر جٹی بیٹھا تنگنے وچ اشنان کیتا
او ہندی پایکے غم دے وچ بیٹھی رانجھے یار دے ول دھیان کیتا
میں تاں تیری امان رانجھڑ یا دے دل وچ اقرار ایمان کیتا
تیرے باہجھ انگ نہ مین جوڑاں شاہد حال دا رب رحمان کیتا
پاک صاف ہاں مین تیرے عشق اندر جھوٹھ موٹھ اوییں اشنان کیتا
وارث شاہ فراق دے نال جٹی بارہ ماہ دا ذکر بیان کیتا

تو اس دن صبح سویرے اُٹھی۔ نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی اور اپنی سکھیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہو گئی۔ تمہاری اس قربانی پر میں ہی نہیں بلکہ آسماں بھی عش عش کر اُٹھا ہو گا۔ اب میرے چاروں طرف بہاریں ہی بہاریں تھیں۔

مگر کل ماں نے میری دوسری شادی کا فیصلہ کر کے مجھے موت کو گلے لگانے پر مجبور کر دیا ہے۔ افسوس! شازیہ میرے کیے ہوئے گناہوں کی سزا تمہیں بھگتنا پڑ رہی ہے۔ جو تم نے کیے بھی نہیں اب میں تمہیں مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ سلیم نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بات ختم کی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

شازیہ اپنے بیٹے (روئی کے گڈے) کو سینے سے لگائے لوری سنا رہی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب جاری تھا۔ آخر کار وہ دن بھی آ گیا جس کا چودھرانی کو کئی روز سے انتظار تھا۔ وہ دن تھا سلیم کی دوسری شادی کا۔ دن میں تمام شادی کی رسومات باخیر و خوبی انجام پائیں۔ ایک طرف چودھرانی انجام سے بے خبر گاؤں میں لڈو بانٹ رہی تھی۔ دوسری طرف بیٹا اپنی زندگی کو داؤ پر لگا رہا تھا۔

سلیم نے نئی دلہن کے پاس جانے سے پہلے دودھ میں زہر ملایا اور پی گیا۔ حویلی کے تمام افراد اس خبر سے بے خبر خوشیوں میں مصروف تھے۔ سلیم اب صرف موت کے بے رحم پنجوں کا منتظر تھا کہ ایسے میں اسے اپنے جسم میں ایک لہر سی سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ زہر نے امر کا کام دیا اور اس کی تمام تر جسمانی رعنائیاں واپس لوٹ آئیں۔ یہ قدرت کا ایک عجیب کرشمہ تھا۔ کافی دیر تو وہ اس شش و پنج میں پڑا سوچتا رہا کہ کہیں میں یہ خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ یہ ایک ایسا موقع تھا جب ایک بنجر پیڑ کو اچانک کونپلیں پھوٹنی شروع ہو جائیں تو وہ پیڑ بھی دیوانہ وار پاگل ہو جاتا ہے۔ پھر موقع جب وہ موت کی بے رحم آندھی سے گرنے میں چند لمحات باقی ہوں۔

یہ قدرت خداوندی کا ایک معجزہ ہی تھا کہ جیسے زہر کھانے سے زندگی رقص کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ سلیم کی آنکھوں میں ایک عجب شعلہ نما چمک تھی۔ وہ سیدھا سیڑھیاں چڑھتا ہوا۔ شازیہ کے کمرے کی طرف لپکا جو بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز تھی قریب کھڑے ہوئے سلیم نے شازیہ کو اچانک ویران باغ میں بہار کے آنے کی خبر دی۔ شازیہ قدرت کے کرشمے پر حیران تھی اور پھر کچھ دیر کے لیے خاموش فضاؤں کو گھورنے لگی۔ اس بہار کی پہلی حقدار تم ہو شازیہ۔

تم اس چمن کی وہ کلی ہو جو عرصہ دس سال سے باغ بہار سے محروم تھی۔ تو نے ویرانے میں رہتے ہوئے بھی اس کی ذات پر بھروسہ کیا۔ جو تمام دنیا کے پالنے والا ہر شے پر قادر ہے۔ شازیہ نے صبر کا دامن ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا آپ میری بات فی الحال چھوڑ دیں یہ بھی آپ پر ایک آزمائش کی گھڑی ہے۔

ان قیمتی لمحات کو کھوئے بغیر اپنی دوسری بیوی کو خوشیوں سے مالا مال کرو۔

اس مقام پر آپ کی کامیابی آنے والی خوشیوں کی ضامن ہے۔ سلیم اپنی دیوی جیسی بیوی کی اس بڑی قربانی پر حیران تھا اور خوش بھی۔ وہ دیوی جس کی سلیم صدیوں پوجا کرتا چلا آ رہا تھا۔ ایک بار پھر آج اس عظیم دیوی نے اپنا آپ لٹا کر دنیا کی تمام خوشیاں اور آرزوئیں سلیم کے پہلو میں نچھاور کر دیں۔ سلیم خدا تعالیٰ کی رضا کے آگے سر جھکائے نئی نویلی دلہن کے کمرے میں داخل ہوا۔ رسمی بات چیت کے بعد دو جسم ایک ہوئے اور......؟

پوری حویلی روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ ساری حویلی میں رات بھر نوکروں کی چہل پہل رہی۔ دوسرے دن علی الصبح سورج ابھی پوری آب و تاب سے طلوع نہیں ہوا تھا۔ سلیم نئی دلہن کو سوتے میں چھوڑ کر باہر آیا۔ تولیہ اُٹھا کر باہر نکل گیا۔ جب کافی دیر ہو گئی دلہن باہر نہیں آئی تو ''ہاجراں'' نے کمرے میں جا کر دلہن کو اُٹھانے کی کوشش کی۔ مگر یہاں معاملہ اُلٹ ہو چکا تھا۔ دلہن کا رنگ نیلا اور وہ موت کی وادیوں میں پہنچ چکی تھی۔ چودھرانی ہاجراں کی چیخ و پکار سے پوری حویلی لرز اُٹھی۔ اسے پوری زمین گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ تمام گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ ہر کوئی اس جواں سال موت پر آنسو بہا رہا تھا۔ یہ اچانک موت کا معاملہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک کیا سے کیا ہو گیا۔ پوری حویلی ماتم کدہ بن چکی تھی۔

سلیم اور شازیہ بھی اس انہونی موت پر خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ چودھرانی ہاجراں کو اپنی بڑی بہو شازیہ پر شک گزرا کہ ہو نہ ہو نئی دلہن کو اس نے زہر دیا ہے۔ مگر سلیم نے ماں کو غلط فہمی کا کہہ کر بات ذہن سے نکال دی۔ اس سے چودھرانی ''ہاجراں'' بیٹے کے سمجھانے پر خاموش ہو رہی۔

آخر کار تمام عزیز و اقارب نے خدا کی رضا کے آگے سر جھکاتے ہوئے ڈاکٹروں کو چیک اپ کروانے کے بعد اسے اتفاقیہ موت قرار دے کر دفن کر دیا گیا۔ موت کی تحقیق کرنے والا ڈاکٹر کمال سلیم کا گہرا دوست تھا۔ وہ دوسرے دن تعزیت کے بہانے جب سلیم سے ملا تو اپنا شک ظاہر کیا کہ سلیم تمہیں علم ہے کہ تمہاری نئی دلہن زہر سے مری ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ اس کا سارا جسم نیلا ہو رہا تھا۔ اس کی موت پورے جسم میں زہر پھیل جانے سے واقع ہوئی ہے۔

سلیم پر یہ تحقیق ایک منٹ کے لیے بجلی بن کر گری۔ حیرانگی کے عالم میں دیواروں کو گھور رہا تھا۔ زہر کا نام سنتے ہی سلیم اپنے حواس درست کرتے ہوئے ڈاکٹر کمال سے مخاطب ہوا اور اپنی تمام آپ بیتی بیان کر دی کہ میں نے دلبرداشتہ ہو کر اس طرح دودھ میں زہر ملا کر کھایا تھا۔

پھر قدرت کے اس عجیب کرشمے کو بیان کیا جو زہر کھانے سے خود میں ایک انجانی طاقت محسوس کی۔ ڈاکٹر نے کہا تم نے بالکل صحیح کہا کہ تمہارے اس کھائے ہوئے زہر سے نئی دلہن کی موت واقع ہوئی ہے۔ اس زہر نے تمہیں نئی زندگی عطا کی اور زندگی کو موت سے ہمکنار کیا۔ خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ اس کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔ حوصلہ رکھو اور اپنی پہلی بیوی کو دنیا کی تمام رعنائیوں اور خوشیو سے خوش آمدید کہو۔

اب تم ایک مکمل شوہر ہو جو بیوی کے تمام حقوق زوجیت کو پورا کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کر سکتے۔ وقت کا بے لگام گھوڑا اپنے راستے میں آنے والی ہر شے کو کچلتا ہوا گزر رہا تھا۔ وقت کبھی نہ رکنے والی سواری ہے۔ حویلی پر ایک مرتبہ پھر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ رات بڑی ڈراؤنی تھی جس رات آندھی اور طوفان زوروں پر تھا۔ درخت جڑوں سے اکھڑ رہے تھے۔ شازیہ کی ساس ''ہاجراں'' فالج کے اٹیک سے اچانک اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ نئی دلہن کی موت دراصل ہاجراں کی موت کا سبب بنی اور یہ موت اس کی اپنی خریدی ہوئی موت تھی۔ جس نے آناً فاناً ہر طرف حویلی اور گاؤں نصیب پور میں اُداسی پھیلا دی تھی۔

کہتے ہیں کہ وقت ہر غم کا مرہم ہے۔ وقت کی چادر دھیرے دھیرے سرکتی رہی اور آج ''ہاجراں'' گاؤں کی چودھرانی (ظلم کی اخیر) خود ان کانٹوں بھری جھاڑیوں کی اوٹ میں قبر کے اندر ابدی نیند سو رہی تھی۔ جس کے طعنے وہ شازیہ کو دیتی تھی کہ وہ کانٹے دار جھاڑی ہو جس پر کبھی پھل، پھول نہیں لگتا۔ مگر اس قدرت کے کرشمے عجیب ہیں وہ چاہے تو صحرا میں پھول، پھل لگا دے چاہے تو بھرے گلشن کو طوفانوں کی زد میں لا دے۔ ادھر اللہ تعالیٰ کی پاک ذات نے شازیہ کے صبر کا صلہ تین خوبصورت بیٹوں کی صورت میں دیا۔

جو حویلی کی رونق اور سلیم کی جائیداد کے وارث قرار پائے لیکن شازیہ اب بھی اپنے بخت آور (روئی کے گڈے) کو بنا سنگھار کر الماری میں رکھتی اور اسے اپنی مرادوں کا منبع قرار دیتی ہے۔ بچوں کے سکول جانے کے بعد اسے اپنے سینے سے لگائے رکھتی اور خوب دل بھر کر اسے پیار کرتی۔ وہ اسے اب بھی اپنی تنہائیوں کا ساتھی قرار دیتی ہے۔

جرم

انیلہ بھلر/امریکا

کیوں کیا تو نے ایسا جرم؟

اپنے گھر میں خود ہی آگ لگا دی۔

اب اس عمر میں یہ لچھن ہیں تیرے۔

تجھ سے اچھی تو کنجریاں ہیں۔

رنڈی کہیں کی۔

میں آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ آئینہ مجھ سے بول رہا تھا۔ باتیں کر رہا تھا۔ مجھ سے سوال کر رہا تھا اور میں اس کے سوالوں کے جواب میں چپ سادھے کھڑی تھی۔ ایسے میں کوئی پتھر آئینے کو لگا اور خون میرے ماتھے سے رسنے لگا۔

آہ۔

مجھے میری ہی آہ سنائی دینے لگی۔

اتنی آگ تھی تیرے اندر؟

آگ اتنی تھی تو شوہر کو بتایا ہوتا۔

غیر مردوں سے یارانے کیوں لگائے؟

مجھے پھر سے جانی انجانی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

....

بلوشہ جا رہا ہوں میں۔

عمر کی آواز کانوں میں پڑی تو میں کمرے سے باہر دوڑی۔ لیکن میرے جانے سے ہی پہلے وہ دفتر کے لیے جا چکے تھے۔ اب گھر تھا، میں اور میری تنہائی۔ شاید میری تنہائی ہی میرے لیے میری تباہی لا رہی تھی۔ میں ایسی بنتی جا رہی تھی جیسی میں کبھی نہیں تھی۔ میں وہ کچھ کرتی جا رہی تھی جس کا تصور میں نے عمر بھر نہیں کیا تھا۔ لیکن کچھ تھا جو مجھے اندر ہی اندر تبدیل کرتا گیا۔

''عمر آج شام ذرا جلدی آ جایئے گا۔ میں عمر سے التجا کر رہی تھی۔

''کیوں تمہیں کچھ کام ہے۔'' مجھے سوجھا نہیں کہ میں کیا جواب دوں۔ میں بیوی تھی، تو بیاہتا۔ کیا کام تھا مجھے اپنے شوہر سے۔ مجھے تو بس عمر کے پاس بیٹھنا اس کے ساتھ ڈھیروں باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن مجھے شادی کے بعد سے ایسا وقت نصیب ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''نہیں کام تو کچھ بھی نہیں۔''

''نہیں آ سکوں گا۔ شام کی کچھ میٹنگز ہیں۔'' وہ ٹائی لگا رہے تھے اور میں اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں تھکی تھکی سی بولی۔

''کھانا کھا کر آئیں گے۔''

''ہاں ظاہر سی بات ہے۔'' وہ کار کی چابیاں اٹھاتے ہوئے بولے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

یہ ایک وسیع و عریض ڈبل سٹوری بنگلہ تھا۔ جس میں میں بیاہ کر آئی تھی۔ بے حد کھلا، سرسبز و شاداب لان، جس میں بے حد حسین رنگوں کے گلاب کھلے رہتے تھے لیکن میں تھی کہ مرجھاتی جا رہی تھی۔ مجھے کسی بھی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ بچپن سے گھر کا ماحول سخت رہا تھا۔ ابا، اماں میں خاص محبت نہیں تھی اور کوئی بڑا جھگڑا بھی نہیں تھا۔ ہم چار بہن بھائی تھے، دو بہنیں اور دو بھائی۔ میں گھر میں سب سے چھوٹی تھی، چھوٹی تھی شاید اسی لیے میری کچھ خاص اہمیت نہیں تھی۔ بہن اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔ بھائی اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ مجھے یونیورسٹی جانے کا شوق تھا لیکن ابا نے بی اے کے بعد پڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ گھر کا ماحول ایسا نہیں تھا کہ میں آزادانہ گھر سے باہر جاتی، یا مجھ سے ملنے کوئی گھر آ جاتا۔ ابا اور اماں کو میرے لیے رشتے چاہئیں تھے وہ بھی کئی شرائط کے ساتھ، لڑکا پڑھا لکھا ہو، امیر ہو، جائداد کا مالک ہو، قبول صورت ہو، ہماری ہی ذات سے ہو وغیرہ وغیرہ۔ اب اتنی شرائط کے بعد رشتہ ملنا آسان بھی کہاں تھا۔ لیکن اماں ابا تھے کہ کسی صورت سمجھوتے پر تیار نہ تھے۔ حتیٰ کہ اس دوران کئی رشتے آئے تھے لیکن بات اکثر ہی ذات برادری پر آ کر رک جاتی تھی۔ بھائی حالات سے چھٹکارہ پا کر امریکہ میں جا بسے تھے اور وہیں پر اپنی اپنی پسند سے شادیاں بھی رچا بیٹھے تھے۔ ایسے میں نزلہ مجھ پر ہی گرنا تھا۔ ہوتے ہوتے میری عمر 29 سال ہو گئی۔ عمر بڑھتی جا رہی تھی لیکن ابا اور اماں ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ گھر کی دیواریں مجھے کھانے لگی تھیں۔ میری کوئی دوست نہیں تھی۔ سارا وقت میں کرتی ہی کیا کہ مزید تعلیم حاصل کرنا ابا کو گوارا نہیں تھا، دوست بنانے کی آزادی میرے پاس نہیں تھی۔ مجھے اپنی نجات صرف شادی میں نظر آتی تھی اور وہی ہو نہیں رہی تھی۔

میں اپنی بڑی بہن کو دیکھ کر اکثر حسد میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ کیا مزے تھے اس کے۔ شوہر تھا، بچے تھے،

سسرال کا پیار تھا۔ اس کے گھر میں جیٹھ، جیٹھانیاں، دیور اور دیورانیاں تھیں۔ سب کے بچے تھے، بھرا ہوا گھر تھا اور ایک ہمارا گھر تھا جو مجھے اکثر قبرستان جیسا لگتا تھا۔

میری ساری امیدوں کا محور بس میری شادی تھی، مجھے لگتا تھا، شادی ہوتے ہی خدا میری ساری محرومیاں دور کردے گا میں ساری عمر شوہر کے پاؤں سے بندھی رہوں گی، اسے دیکھوں گی، اس سے باتیں کروں گے، اسے پوچھوں گی، اسے طرح طرح کے پکوان کھلاؤں گی۔ لیکن شومیٔ قسمت..........

عمر حیات خان کو محض اپنے آپ سے دلچسپی تھی۔ وہ تنہائی جو میں شادی سے پہلے باہر محسوس کرتی تھی اب آہستہ آہستہ اپنے اندر محسوس کرنے لگی ہوں۔ میں سمٹتے ہوئے بکھرتی جارہی تھی۔ بنتے ہوئے ٹوٹتی جارہی تھی۔ میرے سسرال میں بھی کوئی نہیں تھا جو میرے دکھ کو سمجھتا، مجھے دنیا کی کسی شۓ سے دلچسپی نہیں تھی، میں تو صرف عمر کا وقت، عمر کی دلچسپی چاہتی تھی لیکن وہی تھا جو مجھے نصیب نہیں ہورہا تھا۔

''ایسے ہی زندگی گزرانی تھی تو پھر انہیں شادی کی کیا ضرورت تھی۔''

میں اکثر یہ سوال پوچھتے پوچھتے رک گئی کہ عمر کی خشک مزاجی یا سنجیدہ طبیعت کہہ لیجیے کہ میں عمر سے محض کام کی چند باتوں کے سوا کچھ نہ کہہ سکی اور جو میں نہ کہہ سکی وہ کبھی بھی سن نہ سکے۔

شادی کو ایک سال گزر چکا تھا میں 31 سال کی ہو چکی تھی میں نے 10 سال شادی کا انتظار کیا۔ اس لمحہ کا انتظار کیا جب میں اپنی زندگی جی سکوں گی لیکن میں زندگی کے معنی سے قطعی ناآشنا ہوتی جارہی تھی۔ عمر اپنے کام میں مگن تھے۔ انہیں صرف پیسے بنانے سے دلچسپی تھی، گھر بنانے کی، فیملی بنانے کی پرواہ انہیں نہیں تھی۔ مجھے کبھی کبھی لگتا تھا مجھے کسی جرم میں عمر قید ہوچکی ہے۔ اس قید میں واقعی عمر گزرنے والی تھی..........

....

''عمر ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔'' میں ایک روز ڈرتے ڈرتے بولی۔

''ہاں۔''

عمر کیا یہ ممکن ہے کہ ہم کسی ڈاکٹر کے پاس جائیں۔

کس لیے۔

عمر ہماری شادی کو کافی عرصہ گزر چکا ہے لیکن بچے..........

''میں کیوں جاؤں؟ تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ......''

وہ یہ کہہ کر آناً فاناً کمرے سے نکل گئے۔

....

بی بی بظاہر تو آپ کی رپورٹس ٹھیک ٹھاک ہیں، لیکن بہتر یہی ہوگا کہ آپ اپنے میاں کا بھی چیک اپ کرالیں۔ Make sure کرنے کے لیے کہ سب ٹھیک ہے۔

ڈاکٹر کے مشورے کے بعد میں نے عمر سے کئی بار کہا لیکن عمر کو وقت نہیں تھا۔ یا وہ جانا ہی نہیں چاہ رہے تھے، میں نہیں جانتی بس وہ نہیں گئے۔

میں محبت کی پیاسی تھی، پیاس پوری نہیں ہورہی تھی سو سوکھی جارہی تھی۔

ایسے میں ایک روز میری ملاقات اس سے ہوگئی اور پھر نہ جانے کیوں میں اس کی جانب کھنچتی چلی گئی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا انجام کیا ہوسکتا ہے؟

وہ ہر روز مجھے ملنے آتا تھا، آتے ہوئے میرے لیے گلاب لانا کبھی نہ بھولتا تھا، میری جانب دیکھتا تھا تو میں خود کو مدہوشی محسوس کرتی تھی، وہ میٹھی میٹھی آواز میں میرے کان میں سرگوشی کرتا تھا تو میں جھرجھرا جاتی تھی۔ میرے وجود سے مجھے اس کی مہک آنے لگی تھی مجھے اتنا سکون عمر کے ساتھ آج تک نہیں مل سکا تھا جتنا میں اس کے پاس محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کی آواز سن کر میری صبح ہوتی تھی اس کا چہرہ دیکھ کر میری شام..........

وہ مجھے جیتتا جارہا تھا اور میں اس کے آگے خود کو ہارتی جارہی تھی۔

وہ مجھے ایک روز شہر کے شاپنگ مال میں ملا تھا۔

مجھے واپسی پر ڈرائیور نے لینے آنا تھا لیکن عمر نے اسے کسی اور کام سے بھیج دیا تھا ایسے میں شایان نے مجھے گھر تک چھوڑا تھا تو میں اُسے چائے کا بول کر اندر لے آئی پھر وہ وہاں سے کبھی نہیں گیا، کہیں نہیں گیا۔

....

عمر میری کالج کی کچھ فرینڈز جو مجھے حال ہی میں بہت سالوں بعد ملی ہیں گھومنے جارہی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ جاسکتی ہوں۔

ہاں چلی جاؤ......

''ایک ہفتہ کا پروگرام ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

عمر کو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی تو میری سہیلیوں سے کیا ہوتی؟ اسے پرواہ نہیں تھی، یہ جاننے میں بھی دلچسپی نہیں تھی کہ میں آخر کن کے ساتھ جاؤں گی اور کہاں جاؤں گی۔

وہ سات دن میری زندگی کے بہترین دن

تھے۔ شایان کے ساتھ، اس کی بانہوں میں جھولتے ہوئے میرا سارا وجود مہکنے لگا تھا۔ میں بولتی تو وہ گھنٹوں میری باتیں سنتا۔ ابا کی باتیں، امی کی باتیں، بہن کے قصے، بھائیوں کی کہانیاں اسے میری ہر بات سے دلچسپی تھی۔ وہ سنتا تھا اور مسکراتا تھا۔

وہ کون تھا، کس خاندان سے تھا، ہمارا رشتہ کیا تھا، مجھے ان ساری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں جو کہ صرف توجہ کی طلبگار تھی مجھے سوائے اس کے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ وہ سات دن تھے یا سات پل میں نہیں جانتی، لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ دن میری پوری زندگی کا اثاثہ تھے۔ میری عمر بھر کی تنہائی دور کرنے کو کافی تھے وہ سات دن۔

....

واپسی پر بھی عمر کا رویہ ویسے ہی تھا۔ مجھے اس سے توقع نہیں تھی، لیکن پھر بھی ایک اندازہ تھا، خواہش تھی یا خیال کہ شاید وہ مجھ سے تڑپ کے میرے بارے میں کچھ کہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مگر پھر وہ بھی نہیں ہوا جو پچھلے کئی دنوں سے ہو رہا تھا۔

اس کے بعد شایان دوبارہ نہیں آیا.........

وہ جس طرح مجھے ملا تھا اسی طرح کھو گیا۔ اس کا موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔ میرے پاس اس کے گھر کا نمبر نہیں تھا۔ دفتر کا تھا جہاں فون کیا تو پتہ چلا وہ وہاں سے استعفیٰ دے کر جا چکا ہے۔ میں ٹوٹتی گئی۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں بھری جوانی میں بیوہ ہو چکی ہوں۔

''کیا شایان کے لیے میں محض وقت گزاری کا ذریعہ تھی۔'' میں خود سے سوال کرتی تھی۔

ہاں اور نہیں تو کیا، اس نے تم سے کوئی وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ تم تو خود ہی اپنا وجود اسے سونپتی جا رہی تھیں۔ وہ وقت گزاری نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔

وقت رکتا نہیں ہے۔ اس کی یہی بات شاید سب سے اچھی ہے۔ وقت آگے بڑھتا ہے تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ میں بھی بدل گئی تھی۔ میں عمر کے ساتھ رہ رہ کر عمر جیسی ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے بیگانہ تھا اور میں اس سے بے خبر۔

اب میں نے ڈرائیور کے ساتھ جانے کے بجائے خود ہی گاڑی چلانا شروع کر دیا تھا۔ میرے انداز اب خود ہی بدلتے جا رہے تھے۔ اب میں وہ دقیانوسی نہیں رہی تھی جیسی میں تھی۔ میری زندگی میں اب کئی لوگ شامل تھے۔ ردا، فرحان، ضیاء۔

ٹرن ٹرن ٹرن۔

Per night کیا ریٹ ہے؟

سوری رانگ نمبر، میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ فون پھر سے بجا۔

ٹرن ٹرن ٹرن۔

ہیلو۔

یہ رانگ نمبر نہیں ہے۔ بالکل ٹھیک نمبر لگایا ہے۔

جی بتائیے کیا چاہیے آپ کو۔

Per night rate۔ وہی بات دہرائی گئی۔

میں سمجھی نہیں کس چیز کا ریٹ پوچھ رہے ہیں آپ؟

ارے تیرا اور کس چیز کا ریٹ پوچھ سکتے ہیں۔

تیرے پاس اور کوئی مال بھی ہے کیا؟

میں کانپ گئی، نہ جانے کتنی دیر میں شاخ کی طرح لرزتی رہی۔ شیشے میں مجھے اپنا عکس ننگا نظر آ رہا تھا اور میرے ماتھے سے اب بھی خون رس رہا تھا۔

عبید اللہ نزاکت / حاصل پور

رونق شہر گماں چھوڑ کے آ جاتے ہیں
ہم سبھی سود و زیاں چھوڑ کے آ جاتے ہیں
ہم کو بھی دیر تلک اپنی خبر ملتی نہیں
جانے ہم خود کو کہاں چھوڑ کے آ جاتے ہیں
ایسا کیا سحر ہے اے عشق ترے کوچے میں
اہل دل کار جہاں چھوڑ کے آ جاتے ہیں
بعض اوقات تو ہو جاتی ہے وہ حالتِ دل
حلقۂ خوش نظراں چھوڑ کے آ جاتے ہیں
جب تری سمت سے آتی ہے صدائے غمِ یار
ہم حساب دل و جاں چھوڑ کے آ جاتے ہیں

....

اعظم سہیل ہارون / حاصل پور

کبھی جو پل میں ہمارا تھا تمہارا ہو بھی سکتا ہے
ترے آنگن میں جگنو سا ستارا ہو بھی سکتا ہے
کسے آباد کرتا ہے؟ کسے برباد کرتا ہے
یہ ظالم عشق ایسا ہے دوبارہ ہو بھی سکتا ہے
ضروری تو نہیں ہر وقت اس کا ساتھ ہی رہنا
اسے کہنا مرا تجھ سے کنارا ہو بھی سکتا ہے
تعلق توڑ کر جینا اسے مشکل نہیں لگتا
کبھی میری طرف ان کا اشارا ہو بھی سکتا ہے
یہ اس نے آج پوچھا ہے بتا نا سچ مجھے اعظم
محبت کے بنا اپنا گزارا ہو بھی سکتا ہے

لاعلاج مرض

طیبہ خان

وسیم نے جوانی کی حد تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ عیاشیاں کیں کہ شرم وحیا کے پردے تار تار کر دیئے۔ ان کے باپ تب ہی فوت ہو گئے جب وہ چھ برس کے تھے۔ رہ گئی بیوہ ماں تو بھلا لڑکوں پر زور ہی کیا چلتا ہے۔ بس غم سہتی رہی اور گھل گھل کر آخر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ لیکن وسیم کو نہ تو سنبھلنا تھا نہ سنبھلے۔ حال یہ تھا کہ جس طرح کھانا پینا اور ضروریاتِ زندگی سے فارغ ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ اسی طرح ہر روز کوئی نہ کوئی بد معاشی کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔ محلے کی لڑکیاں ان کے نام سے کانپ اٹھتیں اور لڑکے پناہ مانگتے تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑا کرنے تک جاتا تھا۔

کوئی تیس سال کی عمر تک جو دل چاہا وہ ہی کیا؟

ادھر جو سنبھلے تو ایسے حیرت انگیز طور پر۔ باپ کی جمع کی ہوئی پونجی تو وہ پہلے ہی نہ جانے کس کس حسن کی دیوی پر لٹا چکے تھے۔ اب انھیں نوکری کی فکر ہونے لگی۔ وہ تو کہو کہ وسیم عقل کے معاملے میں ذرا تیز تھے۔ جو ماں کے کہنے پر ایف اے کا امتحان پاس کر لیا۔ ورنہ شریف بننا تو ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ لگا تار چھ ماہ کی مسلسل دوڑ دھوپ سے ایک دفتر میں کلرک کی ملازمت مل گئی۔ تنخواہ معقول تھی اور کھانے پینے کا گزر راہ آسانی سے ہو جاتا تھا۔ دفتر جانا اور باقی وقت محلے کے بزرگوں کے ساتھ وقت گزارنا ان کا معمول بن چکا تھا۔ ایسے میں بڑوں کو فکر لاحق ہوئی کہ باؤ وسیم کو شرافت کے دائرے میں قید کرنے کے لیے ان کی شادی کر دی جائے۔ ادھر محلے کے بزرگوں کو وسیم نے سعادت مندی سے چاہا کہ انکار کر دیں۔

لیکن گلی کے بڑے بضد تھے کہ وسیم کی شادی کروادی جائے آخر کار انھیں ان سب کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑ گئے اور وسیم شادی کی زنجیروں میں قید کر ہی دیا گیا۔ حالانکہ وہ سب اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ شادی کے نام سے بھاگتے ہیں ازدواجی زندگی کو اچھی طرح نبھا نہ سکیں گے۔ مگر یہاں تو صورت حال بالکل برعکس ہوئی۔ وہ وسیم جو شادی کے نام سے جی چراتے تھے اور معافی مانگتے۔ اب بیوی کی محبت میں دیوانے رہنے لگے۔ دیکھنے والے دیکھتے اور ان کی محبت پر رشک کرتے۔ سب محلے کی عورتیں جب بھی اپنے "شوہروں سے کبھی جو لڑتیں تو رو رو کر وسیم کی مثال دیتی تھیں، کہ بھلا تم کیا جانو" محبت کیا ہوتی ہے"؟ چاہت تو وہ ہے جو وسیم اپنی بیوی سے کرتے ہیں، وہ دن کو رات اور رات کو دن کہہ دے تو ہاں کہتے ہیں۔

وہ اُسی کو دیکھ دیکھ کر تو جیتے ہیں۔ جب مائیں اپنی بیٹیوں کی شادی جیسے اہم مسئلے کے بارے میں دعائیں کرتیں تو آنچل پھیلا پھیلا کر وسیم جیسے سعادت مند شوہر کا حوالہ دے کر کہتی کہ اے رب وسیم جیسا شوہر ہماری بیٹیوں کو عطا کرنا۔ اتنا بیوی کا خیال رکھنے والا شوہر ہے۔

بھلا ایسی دعائیں کیوں نہ مانگتیں؟

کون سا ایسا عیش تھا جو اس کی بیوی کو میسر نہ تھا؟

وہ سارے دکھ اپنی اکیلی جان پر سہتے لیکن بیوی کو کچھ نہ کہتے تھے۔ اُسکے سارے ناز نخرے اٹھاتے تھے۔ بیوی نے ذرا جو کہہ دیا کہ سر میں درد ہے۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کے پاس حاضر ہو گئے اور دواؤں کے ڈھیر لگا دیا۔ سرہانے بیٹھ کر سر دبانا جو شروع ہوئے تو رات گئے تک دباتے رہتے یہاں تک کہ بیوی خود غصے سے ہاتھ نہ جھٹک دے۔ ادھر جو پیٹ میں ذرا سا درد اُٹھا تو انھیں جان کے لالے پڑ جاتے ان کا بس چلتا تو بیوی کے حصے کی دوائی بھی خود کھا جاتے لیکن بیوی کا دماغ تو ساتویں آسمان پر ہی رہتا تھا۔ جب دیکھو غصے میں آگ بگولہ ہی رہتی تھی۔ اُن کو دیکھتے ہی منہ پر بارہ بج جاتے اور رونی صورت بنا لیتی تھی۔ مگر وسیم نے کبھی بھی ان سب باتوں کی پروا نہ کی تھی۔ بس ہر وقت اُس کے آگے پیچھے دم ہلاتے پھرتے تھے، لیکن وہ اتنی محبت کے باوجود اُس پر کوئی ذرہ بھر بھی اثر نہ ہوتا تھا۔

کبھی چپکے چپکے رو رہی آنچل پھیلا کر خدا سے اپنی بد قسمتی کے شکوے کیے جا رہی ہیں۔ لیکن باؤ زبان سے ایک لفظ تک نہ کہتے اتنے صابر تو وہ کبھی نہ تھے مگر نہ جانے ایسا کون سا جادو تھا جو بیوی کے سامنے گونگے بنے رہتے تھے۔ اس کے عشق میں کھوئے رہتے تھے۔

یہ وہی وسیم تھے جو ایک بار غصے میں اپنی ماں پر ہاتھ اٹھا دیا تھا۔ سارے محلے والوں نے لعنت وملامت کی اور کہا کہ شریفوں کے گھر میں ایسا نہیں ہوتا۔ اللہ جنت نصیب کرے مرحومہ کو، مرتے دم تک بیٹے کا ایک دن بھی سکھ نہ دیکھا، دیکھتی بھی کیسے۔۔۔ سارا سکھ تو بیوی کی قسمت میں لکھا ہوا تھا، لیکن وسیم کو ماں کے ستانے کا بدلہ بھی مل گیا۔ بیوی ایسی ناشکری ملی تھی کہ کیا کہنے تھے۔ جن بزرگوں نے بیچ میں پڑ کر شادی کروائی تھی، انھیں بددعائیں دیتی رہتی تھی۔

وسیم کو جو دل میں آتا برا بھلا کہہ ڈالتی۔۔۔ کبھی خدا کا شکر ادا نہ کیا جو اتنا سیدھا سادہ شوہر مل گیا۔ اس کے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ پھوپھی کی نوکرانی تھی انھوں نے سارے گھر کی ذمہ داری اسی کو سونپ دی اور خود وہ چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھاتی تھیں۔ چھ عدد بچوں کی دیکھ بھال یہ معصوم جان اکیلی ہی کرتی تھی۔ سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی تھی، لیکن یہاں میاں کے گھر آ کر تو اس کا دماغ ہی خراب ہو گیا، مگر اُن کی محبت و خدمت میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ ویسے بھی ان کا یہ حال تھا کہ دفتر سے آئے اور بیوی کو گھر کے تمام بکھیڑوں سے نجات دلا کر اپنے پاس بیٹھا لیتے۔۔۔ کبھی گورے گورے ہاتھ سہلائے جا رہے ہیں، کبھی بازوؤں پر ہاتھ پھیرا جا رہا ہے، اور کبھی پیشانی کے بال سنوار رہے ہیں۔ کبھی سر دبا رہے ہیں۔

بیوی آرام سے بستر پر دراز ہے اور خود پاس بیٹھے مسکرا کر باتیں کر رہے ہیں مگر بیوی ایسے وقت

میں بھی ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھر رہی ہے۔ آپ اندر ہی اندر جلتی رہتی اور بار بار ان کا ہاتھ جھٹک رہی ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے ماتھے پر ایک شکن تک نہ پڑتی تھی۔ کھانے کا وقت ہوا تو خود ہی بیوی کو پیش کرے اور قسمیں دے دے کر ایک ایک نوالہ اپنے ہاتھوں سے کھلایا جا رہا ہے۔ ہزار ہا کوشش کرتے کہ وہ خوش رہے۔ بھلا کون سا شوہر اتنی فرماں برداری کرتا ہے؟ بڑے بڑے دعوے کرنے والوں کو دیکھا ہے مگر شادی کے بعد بیوی کو کیا مجال جو بولنے بھی دیں۔ جو بات شوہر نے کہہ دی وہ پتھر پر لکیر ہے۔ بس ہر بات اپنی ہی منواتے ہیں۔ غریب بیوی منہ سے اُف تک نہیں کر سکتی۔ لیکن باؤ کی بیوی۔۔۔۔ جو کچھ منہ سے کہہ دے ان کے لیے خدا کا حکم ہو جاتا اس پر بھی بیوی سیدھے منہ بات نہ کرتی تھی تو پھر پر ان کی بدنصیبی۔۔۔۔ بعض لوگوں کی یہ رائے تھی کہ ان کی بیوی کا کسی اور کے ساتھ معاملہ ہے تب ہی ان سے خوش نہیں رہتی۔ بعض کا خیال تھا کہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اتنی دکھی رہتی ہے۔ کچھ کہتے کہ بانجھ ہوگی جو ابھی تک اولاد نہ پیدا کر سکی، ورنہ تو نو مہینے بعد ہی بچہ پیدا ہو جاتا۔ لیکن اس کم بخت کی شادی کو تو پانچ سال کا عرصہ ہو گیا ہے لیکن ایک بھی بچہ پیدا نہ ہوا تھا۔

وسیم کیا مجال جو کسی لڑکے یا لڑکی کو نظر بھر کر دیکھیں ایسی صورتحال میں اگر سب کو ان سے ہمدردی تھی کیا ہوا تو؟ سب گلی والیاں ان کی بیوی کے عیش سے اتنی متاثر تھیں کہ جب ان کے گھر سے آتیں تو گھنٹوں وہیں کا ذکر کرتی رہتیں۔ ''وسیم کی بیوی کے زیور دیکھ کر جلتی تھیں اور وہ اتنے قیمتی لباس جو پہنتی تھی'' حسین بھی اس قدر تھی کہ پہلی نظر میں ہی دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ جب بھی بنتی سنورتی تو نظر ہی نہ ٹھہرتی۔ خوبصورت چہرہ لمبی لمبی آنکھیں، گھنی سیاہ زلفیں لچک دار کمر اور اوپر سے ادائیں ایسی کہ قیامت خیز۔ اسی لیے تو وہ سامنے بیٹھا کر گھنٹوں اُسے تکتے رہتے تھے۔

خیر کچھ بھی ہو۔ یہ دیکھو بیوی کی محبت کیسی ہے، میں اس کی جگہ ہوتی تو عمر بھر پاؤں دھو دھو کر پیتی۔

غرض اس قسم کی اور باتیں ہوتی تھیں۔

جب وسیم کے دوست انھیں چھیڑتے، مجنوں جیسی محبت پر طنز کرتے دوستوں سے دور رہنے پر شکایتیں کرتے۔

''وسیم تم رن مرید ہو گئے ہو کبھی ہمیں بھی وقت دیا کرو۔''

کئی دوست کہتے ہیں:

''تمھیں تو دفتر سے آنے کے بعد بیوی سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ باؤ صفائی پیش کرتا اور اِن پر وہ کہتے کیا بھابی سخت مزاج ہیں؟'' جو تمہارے کہیں آنے جانے پر پابندی ہے

وسیم کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے لیکن بچہ پیدا نہ ہوا۔ اس کا ملال گلی والوں سے زیادہ اور کس کو ہوتا۔ عورتیں صاف کہہ دیتی کہ اس کی بیوی بانجھ ہے جو اب تک بچہ نہیں ہے۔ ہائے افسوس وسیم اُن کے بعد ان کے گھر کا مالک کون ہوگا؟ نسل مٹ جائے گی۔ یہ ساری باتیں اڑتے اڑتے وسیم کی بیوی کے کانوں تک بھی پہنچیں: تو وہ بلبلا اٹھیں۔ رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔ ان لوگوں کو آنچل پھیلا کر طعنے دینے لگیں۔ جنھوں نے بیچ میں پڑ کر شادی کروائی تھی۔ اپنے لیے بھری جوانی میں موت مانگ لی اور تین دن تک وسیم سے لڑتی رہیں، لیکن شاباش ہے جو انھوں نے پلٹ کر ایک بات کا جو بھی جواب دیا ہو۔ یوں لگا جیسے ان کے منہ میں زبان کا نام ونشان ہی نہیں ہے ازل سے ہی سے ہی دنیا میں آئیں ہیں۔ جب لڑائی ختم ہوئی تو ایک سونے کی چین لا دی تا کہ بیوی کا موڈ خوشگوار ہو جائے۔ لیکن جناب یہاں معاملہ بالکل برعکس ہوا۔ رنجیدگی بڑھتی گئی اور آخر کار وہ رنج وغم نے بیماری کی صورت اختیار کر لی۔ ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے لیکن معاملہ نہ سنبھلا بیوی کی طبیعت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ اس کے سامنے شرافت کے پیکر تھے مگر اب اس کے دکھ میں اندر ہی اندر گھلتے رہتے تھے۔ اب بیوی پر غشی کے دورے بھی پڑنے لگے اس صورت حال میں گھر کو سنبھلنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کڑے وقت میں انھوں نے چاہا کہ کوئی ماسی کام کرنے کے لیے مل جائے مگر کوشش کے باوجود انتظام نہ ہو سکا۔ بہر حال سب کی کوششوں کے بعد ایک لڑکا رحیم مل گیا۔ جو بڑا ہی غریب تھا۔ رحیم لمبے قد کا بڑی بڑی آنکھیں، سینہ چوڑا، رنگ سرخ اور شباب سے بھرپور تھا مجبوری میں انھوں نے ہچکچاتے ہوئے ملازمت کے لیے رکھ لیا۔ وقت ایسا تھا کہ ان کی چاند جیسی بیوی چار پائی پر ایڑیاں رگڑ رہی تھی اس کڑے وقت میں سارے گھر کی دیکھ بھال کرنا مشکل تھا۔ رحیم کو گھر کے کاموں کے لیے رکھ لیا گیا۔ اُن کے لیے گھر اور دفتر کو دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

کہنے کو وہ غیر تھا لیکن نہ جانے اس کے دل میں کونسا رحم کا جذبہ تھا جو سارا دن بھاگ بھاگ کر سارے کام کرتا۔ کیا مجال جو منہ سے اُف تک بھی کرتا۔ اُدھر باؤ وسیم دوائیاں لینے گئے اور اس نے سارے کام چھوڑ کر اُن کی جگہ پُر کر دی۔ اپنی مالکن کے سرہانے بیٹھ کر گھنٹوں سر دباتا اس وقت تک نہ ہٹتا جب تک وہ پیار سے اس کا ہاتھ نہ ہٹا دیتیں۔ اُس لڑکے کے آنے سے وہ خوش رہنے لگی تھیں۔

سچ بات تو یہ ہے کہ رحیم اُن کا جتنا خیال رکھتا کوئی سگا بھی نہ کرتا۔ کوئی چار ماہ بعد کے بعد بیوی تندرست ہو گئیں اور وسیم کی نسبت وہ رحیم کے ساتھ زیادہ خوش نظر آنے لگی۔ اُس دن وہ سکن رنگ کا کرتہ، ساتھ میں سرخ چست پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ ہلکے اورنج رنگ کی لپ اسٹک، آنکھوں میں کاجل اور گھنے سیاہ بال کھولے ہوئے وہ کسی حور جیسی لگ رہی تھی۔ جب وہ وسیم کے سامنے آئی تو تو وہ کتنی ہی دیر تک اُسے یونہی تکتا رہا۔ جیسے کوئی صحرا کا مسافر تپتی ہوئی ریت میں دو پل سکون حاصل کرنے کے لیے کتنے ہی میلوں کا سفر طے کر کے آتا ہے اور سکون کا متلاشی اپنی منزل پا کر بے خود ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اُس نے بھی اُس کی آنکھوں میں اپنا ہی عکس دیکھا تھا اور پھر دونوں ایک دوسرے کے حسن و شباب میں کتنے ہی وقت تک ڈوبے رہے۔ اب وہ بے حد ہشاش بشاش رہنے لگی۔

بیماری تو دور دور تک نہ دکھائی دیتی تھی بلکہ اس کی جگہ حسن و شباب نے لے لی تھی۔ اب اُس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹتی تھی یوں محسوس ہوتا جیسے اُس کی بے چین روح کو قرار مل گیا ہو۔ ہونٹوں پر ہنسی، آنکھوں میں شرارت، چہرے پر تروتازگی رہنے لگی تھی۔

لیکن وسیم کو پھر نہ جانے ایسا کیا ہوا؟ کہ جیسے ہی بیوی خوش رہنے لگی وہ فکر مند رہنے لگ گئے۔ حالانکہ انھیں تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ بیوی جس کا منہ ہمیشہ سوجا رہتا، اب خوشی سے کلی کی طرح کھلی رہتی تھی۔ مردہ سی چال میں چستی آ گئی۔ خوبصورت آنکھوں میں چمک رہنے لگی تھی گویا یوں لگتا تھا جیسے اس کی جوانی دوبارہ لوٹ آئی ہو۔ کام کاج سے اکتانے والی اب ہر وقت رحیم کا ہاتھ بٹاتی ۔ پھر وسیم کی رنجیدگی کا سبب؟؟؟ وہ جب دفتر سے واپس آتے اور دیکھتے کے بیوی رحیم کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی ہے تو نہ جانے کیوں غمگین ہو جایا کرتے، کپڑے تبدیل کر کے وہ دھڑام سے پلنگ پر گر جاتے اور حیرت سے باورچی خانے کی طرف دیکھتے رہتے لیکن وہ دونوں ہر طرف سے بے خبر، ایک دوسرے کی مسکراہٹوں میں گم رہتے اور یہاں وسیم انگاروں پر لوٹتے رہتے اور وہ ہر چیز سے بے خبر ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف رہتے۔

میرا بس چلتے تو میں تم کو کام نہ کرنے دوں۔ وہ اس کے خوبصورت رخسار کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہتی:

''ایک دن میں نکال دیں باؤ جی رحیم لیٹے ہوئے باؤ کی طرف اشارہ کرتا۔ کبھی نہیں، مجھ سے اب اکیلے میں اتنا کام کاج نہیں ہوتا، ہو جواب دیتے ہوئے کہتی

''آپ نے تو اپنی محبت کے حصار میں قید کر لیا ہے۔'' تمھیں پا کر ہی تو مکمل ہو گئی ہوں اب تو زندگی میں سب رنگ اچھے لگتے ہیں نہ جانے کتنی ہی دیر تک وہ باتوں میں مصروف رہے اور بعد میں ہنسنا شروع ہو گئے تھے۔

رحیم یہاں آؤ!'' باؤ دونوں کی ہنسانے کی آواز سے تڑپ کر پکارتے،'' آخر کیا کام ہے''؟ وہ اٹھلاتی ہوئی ان کے پاس آ جاتی ۔ ''یہاں میرے پاس بیٹھو ٹھنڈک میں ۔۔۔ وہاں آگ کے سامنے طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

''مجھے ٹھنڈک کی ضرورت نہیں ، وہاں ذرا کام کاج میں دھیان بٹا رہتا ہے۔ وہ کڑھ کر کہتی:

''چولہے کے پاس تمہارا دھیان بٹتا ہے اور میری باتوں سے نہیں!'' وہ تلملا کر کہتے ۔ ''تمہاری باتیں!''۔ ۔وہ ایک دم غم میں تڑپ اُٹھتی ۔۔۔ تمہارے پاس باتیں ہی کیا رکھی ہیں۔ اب کی تنخواہ میں یہ لا دوں گا ہو لا دوں گا۔ بس! پانچ سال ہو گئے ہیں یہی باتیں سنتی آ رہی ہوں، آخر کبھی اکتا بھی تو (جاتی ہوں)۔

''ارے! میں کب کہتا ہوں کہ تم دل نہ بہلاؤں ۔۔۔ وہ دب کر کہنے لگے'' مگر دیکھو میرے کہنے کا مقصد ہے کہ رحیم نوکر ہے اس کو زیادہ سر پر چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

''بھلا اس میں برائی کیا ہے۔ اُس سے سیدھے منہ بات نہ کی جائے تو وہ کام میں دھیان نہیں دیتے'' ہنستی ہوئی پھر باورچی خانے میں چلی جاتی ہے۔

''خدایا۔۔۔ تو رحیم کو اُٹھا لے'' ۔۔۔ باؤ بلک کر کوستے۔ بالکل چپکے چپکے بے کس عورتوں کی طرح۔ بیوی کی خوشیاں بڑھتی گئیں اور باؤ غم سے پاگل ہونے لگتے۔ آخر محلے والوں کا خیال تھا کہ بچہ نہ ہونے کی وجہ سے غم زدہ رہتے ہیں۔

اور پھر منحوس رونی صورت بیوی کے ساتھ۔ آخر ایک بزرگ نے صلاح دیتے ہوئے باؤ کو کہہ ہی دیا۔ کہ تم دلہن کا علاج کیوں نہیں کرواتے۔ گود بھر جائے گی تو دل کو ٹھنڈک پہنچے گی۔

''جی! اب ارادہ ہے کہ اس کا علاج کراؤں'' باؤ نے سعادت مندی سر جھکا دیا اور پھر ان بزرگ نے ایک ڈاکٹر کا بتایا جو کہ انتہائی سمجھ دار تھا۔ اور اس نے بیوی کے بانجھ پن کا علاج کیا۔ اس کے برعکس اخباروں، رسالوں پر اشتہاری دوائیوں کے آڈر دینے شروع کر دیئے۔ علاج شروع ہو گیا۔

یہ باؤ وسیم ہی کا حوصلہ تھا جو اس بانجھ عورت کے عشق میں پیسے کو پانی کی طرح بہا رہے تھے، مگر کون جاتے باؤ کی خود غرضی۔ ایک بڑھیا بیوی کو دوا کی نہ کھانے کے لیے دیتے بلکہ خود ہی ساری دوائیں کھا لیتے۔

یونہی ایک سال اور گزر گیا، ایک دن وہ حیرت سے اچھل پڑے، شاید داؤں کے اثر سے چہرے پر رونق بڑھ گئی۔ لاغر جسم بانس کی طرح اکڑ گیا۔

''یہ کیا ہے''؟ ۔۔۔ وہ غصے میں گرجنے لگے۔ ان کی بیوی سہم کر رہ گئی اور دوپٹہ سینے پر لینے کی بجائے پیٹ پر دے دیا۔

''بولو! یہ کیا ہے۔۔۔؟ انہوں نے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہی جو تم سمجھ رہے ہو'' اب اس نے کچھ ہمت کر کے جواب دیا اور باؤ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''اتنے عرصے سے تم نے میرا علاج کیا تو میں امید سے نہ ہوں؟

''خدا تم کو غارت کر دے!'' باؤ غصے سے چیخ پڑے اور دو تھپڑ رسید کیے۔ غصے سے گرجنے لگے۔

''یوں تو مرنا مشکل ہے، تم کو ایک بچے کا باپ بنا دوں، پھر دیکھا جائے گا۔

ارے کہیں لوگ مجھے کچھ کہتے کہتے سچ مچ تمہاری ہی حقیقت کو نہ جان جائیں۔۔۔ وہ طنزیہ ہنسی۔ باؤ کا سرخ چہرہ زرد پڑ گیا اور ان کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔ نا جانے کب تک اپنی بے بسی پر تڑپتے رہے۔

میری بات تو سن لو۔۔۔ انھیں روتا دیکھ کر وہ تڑپ اٹھی۔ چھ سال کا تمہارا ساتھ تھا۔ کچھ نہیں تو ایک گھر میں رہنے کی محبت اسے ضرور تھی۔ تم نے اتنے سال میرا خیال رکھا اتنا حق تو میرا بنتا ہے کہ تمھیں ایک اولاد کا تحفہ تو دے دوں۔

''ہم دونوں کو مر جانا چاہیے۔۔۔ میں مجبور تھی۔۔۔ اور ۔۔۔ اس کا گلا بھر آیا وہ پلنگ پر گر کر سسکیاں بھرنے لگیں۔

چند ماہ بعد ایک ننھا سا خوبصورت بچہ گھر سر پر اٹھائے رو رہا تھا۔

بیٹا مبارک ہو میاں! یہ سب ہماری دعاؤں کا اثر ہے اور باؤ نے شرم سے سر جھکا لیا۔

محمد ادریس لاہوری/ناروے

مت اُٹھاؤ یہ ڈھیر کچرے کا اس پہ بچہ غریب پلتا ہے

مادہ پرستی کے موجودہ دور میں دیارِ غیر میں بیٹھ کر شعر کہنا لائقِ تحسین ہے۔ سمندر پار اُردو ادب کی بستیاں قصہ پارینہ بنتی جا رہی ہیں۔ کتنے ہی معتبر نام جن سے بیرونِ ملک جہانِ سخن آباد تھے۔ اب خیال و خواب ہو گئے۔ نسلِ نو کی اردو زبان سے بیگانگی بھی دل افسردہ کرتی ہے۔ ان حالات میں کسی نئے مجموعے کی آمد نوید بہار سے کم نہیں ہوتی۔ ناروے میں بطور پاکستانی سفیر میں نے چند برس گزارے ہیں۔ وہاں میرے چند دوست ادیبوں نے شاعری میں قابلِ ذکر کام کیا ہے اور یادگار مشاعروں کا انعقاد بھی کرایا ہے۔ اس کارِ عظیم کو اب جو دوست آگے بڑھا رہے ہیں ان میں محمد ادریس لاہوری کا نام صفِ اوّل میں شمار ہوتا ہے۔ دریچہ کے پلیٹ فارم سے اوسلو میں یادگار تقاریب کا انعقاد کا سہرا اب اُس کے سر ہے۔ "ذرا سی دھوپ رہنے دو" میں ادریس لاہوری کی شخصیت اور محبت سمٹ آئی ہے۔ سادہ اور آسان زبان میں کی گئی یہ شاعری قاری کے دل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ محمد ادریس لاہوری خود بھی صاف شفاف اور آسان ہے اور اُس کی شاعری بھی اُس کی شخصیت کی غماز ہے۔ اُسے اپنی شاعری کے حوالے کے لیے کسی گواہی کی ضرورت نہیں۔ وہ اچھا شاعر ہے اور ابھی اس نے مزید اچھا شاعر بننا ہے۔ میں اُسے اوّلین مجموعے کی اشاعت پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک پیش کرتا ہوں۔ (عطاء الحق قاسمی)

سینے سے ہم لگائیں گے حسن و جمال کو
ڈھونڈیں گے وصلِ یار میں اوجِ کمال کو
آنکھوں میں لے کے آ گیا چاہت کے آئینے
سمجھا نہیں ہے دل ابھی دنیا کی چال کو
آیا ہوں جنگ ہار کے اک اور پیار کی
پھر سے عروج دے دیا اپنے زوال کو
چہرہ تھا یا کہ پھول تھا خواب و خیال میں
جس نے سجا کے رکھ دیا خواب و خیال کو
رقصاں تھا آسمان بھی ادریس میرے ساتھ
مہمیز کر گیا کوئی دل کی دھمال کو

دُکھ ہو یا کوئی خوشی کچھ بھی نہیں
بن ترے یہ زندگی کچھ بھی نہیں
تیری آنکھوں کی زباں کچھ اور ہے
سو کہی یا ان کہی کچھ بھی نہیں
تیرے رنگ و روپ کے تو سامنے
چاندنی یا روشنی کچھ بھی نہیں
اس قدر ہے دل نشیں تیرا سخن
میرا رنگِ شاعری کچھ بھی نہیں
ہے سبھی کچھ ہی پرانا ایک سا
چیز دنیا میں نئی کچھ بھی نہیں

دیکھئے تو سب ہے اس کے ہاتھ میں
سوچئے تو آدمی کچھ بھی نہیں
تیرے ہونے سے ہے ہونا اس کا بھی
ہستی تو ادریس کی کچھ بھی نہیں

اُجالوں میں لپٹے اندھیرے ملے ہیں
ہمیں ٹمٹماتے سویرے ملے ہیں
بکھیڑا کوئی بھی سلجھتا نہیں ہے
غموں کے یوں سائے گھنیرے ملے ہیں
جنھیں ہم نے رہبر بنایا ہوا تھا
وہی ہم کو بن کے لٹیرے ملے ہیں
مرے دل کے اندر بھلا اور کیا تھا
تری یاد کے ہی بسیرے ملے ہیں
ملی ہو ہمیں جیسے سوغات کوئی
یہ ادریس یوں درد تیرے ملے ہیں

دل کے جذبوں کو آشکار کروں
چاہتوں کا میں کاروبار کروں
بھول جاؤں سبھی خساروں کو
ٹوٹے رشتوں کو استوار کروں
میں نبھاؤں وفا کو آخر تک
جب کروں تو فقط میں پیار کروں
حُسن تیرا ہی اک قیامت ہے
کیوں قیامت کا انتظار کروں
بن کے ادریس اک مسیحا میں
اپنی ہستی کو غم گسار کروں

روز چہرہ نیا بدلتا ہے
یہ مقدر بھی چال چلتا ہے
مت اُٹھاؤ یہ ڈھیر کچرے کا
اس پہ بچہ غریب پلتا ہے
دل کہ میرا کبھی نہیں بنتا
دیکھنے کو تجھے مچلتا ہے
میری سوچوں کا میرے لفظوں میں
دیپ سورج کی مثل جلتا ہے
دیکھتے ہی وہ منزلوں کے نشاں
پاؤں زنجیر کو کچلتا ہے
جب بھی دیکھا ہے غور سے میں نے
آئینے سے کوئی نکلتا ہے
یہ بھی ادریس کارِ ہستی ہے
کوئی گرتا کوئی سنبھلتا ہے

فرزانہ فرحت/ برطانیہ

ہوائے تند گئی ہے جسے گراتے ہوئے
لگے ہیں مجھ کو زمانے وہ گھر بناتے ہوئے

لے چلو مجھ کو صنم اُن آسمانوں سے پرے
میں نے دیکھا ہے اجالا دو جہانوں سے پرے

اے مرے صیاد اس کمرے کی کھڑکی کھول دے
میں نے دیکھا ہی نہیں ہے ان مکانوں سے پرے

میری کشتی کے لئے کوئی نہیں ہے بادباں
اک کھڑا طوفان ہے اِن بادبانوں سے پرے

باغباں تیرے چمن میں ہے بہار آئی ہوئی
ہیں مگر سوکھے شجر بھی گلستانوں سے پرے

سوچتی ہوں دیکھ کر میں سنگِ مرمر کے مکاں
بے مکاں بھی لوگ ہیں اونچے مکانوں سے پرے

آہنی پنجرے کے اندر قید ہیں پنچھی کئی
ہیں کئی پرواز میں اُن آشیانوں سے پرے

کس طرف فرحتؔ نکل آئی میں یوں چلتے ہوئے
کڑکڑاتی دھوپ ہے اُن سائبانوں سے پرے

میں چل رہی ہوں کہ جس پر نقاب اوڑھے ہوئے
زمین دور تلک ہے سراب اوڑھے ہوئے

ہیں مفلسوں کیلئے خار کے جہاں بستر
وہاں امیر ہیں سوئے گلاب اوڑھے ہوئے

کھلی جو آنکھ وہی نفرتوں کا منظر تھا
میں سو رہی تھی محبت کے خواب اوڑھے ہوئے

بہت دنوں سے یہ دھرتی کے رنگ مدہم ہیں
بہار آئے کسی دن شباب اوڑھے ہوئے

عجیب رنج کا دورہ ہے چار سو میرے
ہیں میرے لوگ دکھوں کے عذاب اوڑھے ہوئے

اسی لئے تو اجالے ہیں ساتھ ساتھ مرے
کہ میں ہوں نور کی چادر جناب اوڑھے ہوئے

یہ سوچ کر نہ اٹھایا تھا سجدہ گاہ سے سر
مرا تھا عشق کا سجدہ ثواب اوڑھے ہوئے

لپٹ کے چاند کی کرنوں سے ہوں چلی فرحتؔ
اندھیری شب میں کوئی ماہتاب اوڑھے ہوئے

بچھڑی ہوئی رتوں کی جو یادوں کا شور ہے
گرداب سا گھرا ہے ہواؤں کا شور ہے

اے میرے راہبر مجھے کوئی چراغ دے
تاریک رہگزر ہے بلاؤں کا شور ہے

کیونکر وفا کی آس رکھیں دشمنوں سے ہم
بس دوستوں کی آج جفاؤں کا شور ہے

سنگیت کی صدا کہیں مرغانِ خوش نوا
جاری ہے ساز گیتی صداؤں کا شور ہے

فرحتؔ عجیب شور ہے یہ مرے چار سو
ہے شور بجلیوں کا گھٹاؤں کا شور ہے

ہوائے تند گئی ہے جسے گراتے ہوئے
لگے ہیں مجھ کو زمانے وہ گھر بناتے ہوئے

کبھی میں وقت کے پنچھی کو قید کر نہ سکی
جو اڑ گیا تھا مجھے آئینہ دکھاتے ہوئے

دکھوں میں لپٹی ہوئی تھی یہ شاعری میری
میں رو پڑی تھی کسی کو غزل سناتے ہوئے

مری نظر اسے اب بھی تلاش کرتی ہے
بچھڑ گیا تھا جو اک دن مجھے رلاتے ہوئے

کبھی تو ان کو حقیقت کا روپ دے جاؤ
میں تھک گئی ہوں یہ خوابوں کے گھر بناتے ہوئی

اسی لئے تو مجھے ہارنے کا خوف نہیں
میں جیت جاتی ہوں اکثر شکست کھاتے ہوئے

انہی دکھوں کی اذیت سے چور ہوں اب تک
مجھے جو وقت نے بخشے ہیں آزماتے ہوئے

اسی لئے مرے شعروں میں درد ہے ابتک
کٹی ہے عمر مری رنج و غم کماتے ہوئے

ملا نہ آج تلک مجھ کو موسم فرحتؔ
پلٹ گئی ہے ہمیشہ بہار آتے ہوئے

معصوم ہیں سادہ ہیں کہ چالاک ہیں آنکھیں
چہرے کی مگر قیمتی پوشاک ہیں آنکھیں

تم آج مری آنکھ کی لالی پہ نہ جاؤ
گزری ہے کچھ ایسی ہی کہ نمناک ہیں آنکھیں

جن آنکھوں میں رہتے تھے محبت کے مناظر
کیوں مجھ سے خفا اور غضبناک ہیں آنکھیں

آنکھوں سے چھلکتا ہے یہ حسرت کا تصور
جو درد بسا ان میں تو خاشاک ہیں آنکھیں

فرحتؔ تری آنکھوں میں رہے پیار کی دولت
چاہت کی یہ جاگیر ہیں املاک ہیں آنکھیں

وہ ثمر تھا میری دُعاؤں کا اُسے کس نے اپنا بنا لیا
مری آنکھ کس نے اُجاڑ دی، مرا خواب کس نے چُرا لیا
تجھے کیا بتائیں کہ دِلنشیں، ترے عشق میں، تری یاد میں
کبھی گفتگو رہی پھول سے، کبھی چاند چھت پہ بُلا لیا
مجھے پہلے پہلے جو دیکھ کر ترا حال تھا، مجھے یاد ہے
کبھی جل گئیں تری روٹیاں، کبھی ہاتھ تو نے جلا لیا
مری جنگ کی وہی جیت تھی، مری فتح کا وہی جشن تھا
میں گرا تو دوڑ کے یار نے مجھے بازوؤں میں اُٹھا لیا
مرے دُشمنوں کی نظر میں بھی مرا قد بڑا ہی رہا سدا
مری ماں کی پیاری دُعاؤں نے مجھے ذلتوں سے بچا لیا

تمہاری باتوں میں رنگ، سوچوں میں خوش گمانی ہے یا نہیں ہے
مجھے بتاؤ یہ خود فریبی، یہ رائیگانی ہے یا نہیں ہے
کسی کے شجرے میں کیا لکھا ہے مجھے غرض ہی نہیں ہے اس سے
زباں کھلے گی تو علم ہوگا وہ خاندانی ہے یا نہیں ہے
اگر یہ طے ہے کہ آسماں پر بنائے جاتے ہیں سارے رشتے
تو تم بتاؤ ہماری جوڑی پھر آسمانی ہے یا نہیں ہے
میں اپنی تنہائی تن پہ اوڑھے پلٹ رہا ہوں یہ دیکھنے کو
وہ آج بھی اپنی بے وفائی پہ پانی پانی ہے یا نہیں ہے
میں اُن سے شہباز پوچھتا ہوں، بتاؤ مسند نشین لوگو!
حسین لوگوں کے دِل میں رہنا بھی راجدھانی ہے یا نہیں ہے

ہماری روح تلک رقص کرنے لگتی ہے
جب اُس کی آنکھ سناتی ہے عارفانہ کلام
یہ خود کلامی حقیقت میں خود کلامی نہیں
کسی کے ساتھ میں کرتا ہوں غائبانہ کلام
ہمیں ملا ہے بزرگوں سے عشقِ آلِ رسول
ہمارے خون میں شامل ہے صوفیانہ کلام
دعا پہ اس لئے ہم کو یقین ہے صاحب
جو دل سے نکلے وہ ہوتا ہے معجزانہ کلام
تمہارے حسن پہ میں نے کلام جب بھی کیا
مرے کلام پہ کرنے لگا زمانہ کلام
کسی کے ہونٹوں پہ آنے کی دیر تھی شہباز
کہ تازہ لگنے لگا ہے مرا پرانا کلام

وہ جو اِک پھول ہے پتھر بھی تو ہو سکتا ہے
نرم لہجہ کبھی خنجر بھی تو ہو بھی تو ہو سکتا ہے
کیا ضروری ہے کہ چاہت میں وہ سینے سے لگے
اِس لپٹنے کا سبب ڈر بھی تو ہو سکتا ہے
دُور سے پھول جسے آپ نے بھجوائے ہیں
آپ سے مِل کے وہ بہتر بھی تو ہو سکتا ہے
ہم جسے آپ کے آنچل کی جھلک سمجھے ہیں
وہ کوئی خواب کا منظر بھی تو ہو سکتا ہے
تیری قُربت میں جسے لفظ نہ سوجھا کوئی
تیرے غم میں وہ سخن ور بھی تو ہو سکتا ہے
کیا ضروری ہے کہ دروازے پہ پتھر ہی لگے
دیکھ باہر تیرا نیّر بھی تو ہو سکتا ہے

ٹھہر ٹھہر کے خُدارا کلام کیجئے ناں
اُداس شب کا بھی کچھ احترام کیجئے ناں
سُنا ہے آپ کی آنکھیں ہیں بادشہ آنکھیں
نظر اُٹھائیے ہم کو غلام کیجئے ناں
یہ چاند اہلِ محبت کا پیر و مُرشد ہے
یہ آ گیا ہے تو اُٹھ کر سلام کیجئے ناں
وہ شام جس میں ستاروں کے بھاگ جاگتے ہیں
اِک ایسی شام ہمارے بھی نام کیجئے ناں
مقامِ عشق کو شہباز گر سمجھنا ہے
تو دِل کے غارِ حرا میں قیام کیجئے ناں

دھمال ڈالتے لفظوں میں عاجزانہ کلام
غزل کے روپ میں لائے قلندرانہ کلام

ہر سمت بکھرتی ہوئی خوشبو کی طرح ہیں
کچھ لوگ مرے شہر میں اُردو کی طرح ہیں
کچھ لوگ محبت کے پیمبر ہیں زمیں پر
کچھ لوگ سیہ رات میں جگنو کی طرح ہیں
گر سکتے ہیں دامن پہ کسی وقت بھی اب ہم
رخسار پہ ٹھہرے ہوئے آنسو کی طرح ہیں
سرہانے پہ رکھے ہوئے کچھ خواب ہمارے
پھولوں سے بھرے آپ کے بازو کی طرح ہیں
ہم میر کے دیوان کا اِک شعر ہیں نیّر
ہم زخم رسیدہ کسی آہو کی طرح ہیں

اسد عباس خان/جھنگ

خود ہی بندہ ہوں خود خدا سائیں
آپ اپنا ہوں مبتلا سائیں
جابجا سے مراد یکساں ہیں
مجھ میں ہم تم ہیں جابجا سائیں
میں ستارے شمار کرتا ہوا
رات بھر سو نہیں سکا سائیں
رنج و راحت کا ایک مطلب ہے
دونوں کا ایک ہے مزہ سائیں
میں تری جوں بلائیں لیتا ہوں
تو مرے ناز یوں اُٹھا سائیں
ہائے خلوت ہو یا کہ جلوت ہو
کوئی کب ہے ترے سوا سائیں

شور و غل ہے بہت اس طرف لاتخف
خود ہی میں تیر ہوں خود ہدف لاتخف
نوحہ کرتے ہوئے اور بکھرتے ہوئے
اپنا ماتم کیا صف بہ صف لاتخف
عشق نادِ علیؑ عشق یادِ علیؑ
میں ہوں بندۂ شاہِ نجف لاتخف
عقل بیدار میں عشق بیدار ہے
مجھ کو میں نے دیا یہ شرف لاتخف
اک صدائے دروں، میں کہوں عشق میں
عشق ہوں اور شعلہ بکف لاتخف
میں ہوں سرمد مجھے قتل کر دو اسدؔ
ورد کرتے ہوئے، لاتخف لاتخف

زندہ لوگوں نے زندگی نہیں کی
ان ستاروں نے روشنی نہیں کی
جب سے ناراض ہے وہ شاہ زادی
باغ کی میں نے سیر ہی نہیں کی
بس دعا کر رہا ہوں روز و شب
میں نے مدت سے شاعری نہیں کی
جس تسلسل سے گفتگو کی ہے
کون کہتا ہے خامشی نہیں کی
اک محبت کہ بارہا کی تھی
اک محبت کہ جو کبھی نہیں کی
وہ اشارہ اسدؔ اشارہ تھا
یعنی ان سے جو بات کی نہیں کی

اے کہ دیدِ شوق کو تازہ نظارا چاہیے
قریہ قریہ کو بہ کو مجھ کو تماشا چاہیے
میں حضورِ یار بیٹھا ہوں ازل سے اور مجھے
صرف دنیا صرف دنیا صرف دنیا چاہیے
کس پہ کھلتی جا رہی ہے دم بہ دم وحشت مری
دمِ وحشت خاک تجھ پر مجھ کو صحرا چاہیے
ایک نادیدہ سفر ہے جو مجھے درپیش ہے
جو زمیں سے آشنا ہو وہ ستارا چاہیے
بابِ حیرت کھل رہا ہے اے اسدؔ میرے لیے
اس ہجومِ بے کساں سے مجھ کو رستہ چاہیے

اے صلاح الدین سکھلا رقصِ مستانہ مجھے
اے مرے زرکوب کر دے سب سے بیگانہ مجھے
اے نگاہِ یار مجھ پر بھی جنوں طاری رہے
اے نگاہِ یار کر دے اپنا دیوانہ مجھے
جس طرف بھی منہ کروں وحشت ہے اب چاروں طرف
کون سی جانب نہیں پڑتا ہے ویرانہ مجھے
ٹکٹکی سے دیکھتا ہوں میں مرا عکسِ جمال
کھینچ لاتا ہے یہاں پر آئینہ خانہ مجھے
زیرِ گریہ بے سبب تو میرے ہاتھ آیا نہیں
رات اس نے تھا سنایا میرا افسانہ مجھے
میرے فیضِ عام سے خلقِ خدا ہے فیضیاب
اے اسدؔ وہ کون ہے جس نے نہیں مانا مجھے

فروغِ ادب کے لیے وقف
بہ یاد: سید قاسم محمود
Monthly Book Digest
لاہور
بک ڈائجسٹ
ISSN 2079-4584
bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com
مدیرِ اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ
مدیرِ اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ
بک ڈائجسٹ
0333-4377794

ساجد رضا خان/

اپنی تمام عمر پرندوں میں کٹ گئی
کچھ بھی ہوا تو شور مچانے میں لگ گئے

اچھا منظر دکھائی دیتا ہے
سب معطر دکھائی دیتا ہے
آنکھ بھی زیرِ آب رہتی ہے
دل سمندر دکھائی دیتا ہے
تم کو جو کچھ نظر نہیں آتا
مجھ کو اکثر دکھائی دیتا ہے
آئینہ ہے کہ تیرا چہرہ ہے
بارِ دیگر دکھائی دیتا ہے
آپ جب جب بھی دیکھ لیتے ہیں
سب برابر دکھائی دیتا ہے
جب وہ چھت پر دکھائی دیتی ہے
دل کبوتر دکھائی دیتا ہے
جو زمیں پر نظر نہیں آتا
آسماں پر دکھائی دیتا ہے
ہم جہاں سے جدھر بھی دیکھتے ہیں
آپ کا گھر دکھائی دیتا ہے
جب سے دیکھا ہے آپ کو ساجد
کافی بہتر دکھائی دیتا ہے

مرے کاسے میں صدمے رہ گئے ہیں
کئی لوگوں کے طعنے رہ گئے ہیں
یہاں گاڑی مکمل بھر چکی ہے
مسافر اچھے خاصے رہ گئے ہیں

وہ تصویریں اُٹھا کر لے گیا ہے
یہاں پر صرف خاکے رہ گئے ہیں
تمہارے بن اُداسی چھا گئی ہے
تمہارے بن اکیلے رہ گئے ہیں
نہ جانے کس طرح یہ ہو گیا ہے
جو آگے تھے وہ پیچھے رہ گئے ہیں
تماشہ گاہیں خالی ہو گئی ہیں
مداری اور تماشے رہ گئے ہیں
اُلجھنا پڑ رہا ہے ہر کسی سے
طبیعت میں کیا جھگڑے رہ گئے ہیں
نئے رشتوں کی افزائش بہت ہے
مگر زندہ پرانے رہ گئے ہیں
ہوئی کثرت سے بارش پھر بھی ساجد
بہت سے کھیت سوکھے رہ گئے ہیں

ہم بھی کسی کی کھوج لگانے میں لگ گئے
یعنی ہم اپنے آپ کو پانے میں لگ گئے
پہلے پہل زمیں سے مری بات چیت تھی
پھر آسماں سے ہاتھ ملانے میں لگ گئے
اپنی تمام عمر پرندوں میں کٹ گئی
کچھ بھی ہوا تو شور مچانے میں لگ گئے
پہلے ہم اپنے آپ سے کرتے تھے احتیاط
پھر ہم تمہاری خیر منانے میں لگ گئے

جنگل کے سارے پیڑ مری دسترس میں تھے
اور ہم انہیں شعور سکھانے میں لگ گئے
پہلے زمین کاٹ رہی تھی اذیتیں
پھر ہم زمیں کا ہاتھ بٹانے میں لگ گئے
پانی کی بوتلوں نے دغا دے دیا ہمیں
ہم مشک اور کوزے بنانے میں لگ گئے
دو چار دن میں شہر بسایا گیا یہاں
ویران لوگ ایک ٹھکانے میں لگ گئے

شاخ سے اک دیا جلاؤں گا
میں درختوں کو آزماؤں گا
تم خموشی سے باہر آ جاؤ
ورنہ میں زور سے چلاؤں گا
جب ترا عکس بول اُٹھے گا
میں تجھے آئینہ دکھاؤں گا
کھل کے رویا نہیں گیا مجھ سے
میں کبھی کھل کے مسکراؤں گا
یعنی میں پتھروں کو کاٹوں گا
غار سے راستہ بناؤں گا
ہاتھ رکھ دو ہماری آنکھوں پر
میں کوئی خواب گنگناؤں گا
میں ترے ہجر کو سہوں گا اور
میں ترے ساتھ دل لگاؤں گا

کلنگ سے لنکاوی

یونس وریام/لاہور

لانگلنکوی، جو رسمی طور پر لیانگویوی کے طور پر جانا جاتا ہے کیڈو کا زیور (مالائی لینگاوی پرمتا تا کیڈیہ) اندامان سمندر میں 104 جزائیر کا ایک جزیرہ ہے، جو شمال مغرب ملائیشیاء کے مین لینڈ ساحل سے 30 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے جزیرے کیبہ ریاست کا حصہ ہیں جو تھائی سرحد کے قریب ہے 15 جولائی 2008 کو کیبہ کے سلطان عبدالحلیم نے اپنے گولڈن جوبلی جشن کے ساتھ مل کر لینگکوی پرمتا تا کیڈی میں نام تبدیل کرنے کے لئے رضامند کیا تھا ابھی تک جزائیر کا سب سے بڑا جزیرہ ایک لاکھ آبادی کے ساتھ مہنگالینگانوی جزیرہ ہے، جو کہ ٹوبا جزیرہ کے قریب واقع ایک ہی دوسرا آبادی والا ہے۔

لیانگویہ بھی ایک انتظامی ضلع ہے جس کے ساتھ کوہا شہر کا بڑا شہر ہے۔لیانگویو ایک فری جزیرہ ہے نام لانگلنکوی کا خیال ہے کہ 15ویں صدی کے آغاز سے ہی اس کا نام تبدیل کیا گیا۔

لنکاوی:

لنگ کاوی جو سرکاری طور پر" لنگ کاوی دُر کیداہ" (ملائی: Lungkawi Permata kedah) کہلاتا ہے بحرِ آندم میں 104 جزیروں کا بحرالجزائر ہے اور شمال مشرقی ملائیشیاء کے برِ اعظمی ساحل سے تقریباً 30 کلو میٹر دُور ہے۔یہ جزائر ریاست کیداہ کا حصہ ہیں جو تھائی سرحد کے پڑوس میں ہے۔ 15 جولائی 2008ء میں کیداہ کے سُلطان عبدُالحلیم نے اپنی گولڈن جوبلی کے جشن کی خوشی میں لنگ کاوی پرماتا کیداہ کا نام تبدیل کرنے کی منظوری دے دی تھی۔تب سے جزائر میں سب سے بڑا جزیرہ لنگ کاوی مانا جاتا ہے جس کی آبادی تقریباً 64,792 ہے اور یہ جزیرہ تیوبہ کے نزدیک ترین ہے۔لنگ کاوی بہت بڑے قصبے کواہ کا مہتمم ضلع بھی ہے۔لنگ کاوی ایسا جزیرہ ہے جہاں پر کسٹم وصول نہیں کیا جاتا۔تصور کیا جاتا ہے کہ لنگ کاوی نام پندرہویں صدی کے شروع سے موجود ہے اور بے شک سولہویں صدی میں لنگ کاوی جزیرہ کی کئی طرح سے نقشہ جات پر لنگا،لنکا، لانسورا اور لنگا پورا کے طور پر بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

لنگ کاوی کے نام کی اِبتدا کے متعلق بہت سی آراء ہیں۔ ایک تفسیر کے مطابق ملیشین زُبان کولوکوئیل میں لنگ کاوی کا مطلب ہے سُرخی مائل سنہرا عُقاب ہے۔ملیشین زُبان میں عُقاب کے لئے لفظ ہیلاگ (Helag) ہے جس کا مختصر "لانگ" ہے اور کاوی ایک سُرخ پتھر کا نام ہے جو اچھائیاں لکھنے کے لئے اِستعمال ہوتا تھا۔یہ تفسیر کواہ میں داتارا کے مقام پر لنگ کاوی کی علامت کے طور پر عُقاب کا مجسمہ (Eagle Square) بنانے میں اِستعمال کی جاتی تھی۔

بعض لوگوں کا ماننا ہے کہ لنگ کاوی سے مُراد' لنکا " یا "لنگ کا پوری' ہے جس کا ذکر بھارتی دیو مالاؤں میں درج ہے۔یہ قدیم نام "لنکا" (یا لنکا پورا اور لنکا پوری) قدیم زمانہ سے بھارتی کتاب (رامائین مثلاً راون کا شہر) میں پایا جاتا ہے اگرچہ اصل لنکا کی شناخت یقینی نہیں ہے۔

سنسکرت میں "پُوری" یا "پُورا" کے معنی ہیں قصبہ یا شہر۔لنگ کاوی نام کو بھی "لنگ کا سُوکا" تصور کیا جاتا ہے جو ایک قدیم سلطنت تھی اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا تعلق کیداہ سے تھا۔بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ "لنگ کاوئں" کا مطلب ہے "بہت سے حسین جزیرے"۔بطور ایک سنسکرت لفظ "لنکا" کے معنی ہیں "حسین" جبکہ ہماری اس سے مُراد ہے "بہت سے"۔

سوموار کا روز تھا کیونکہ ساری رات جاگ کر گزاری تھی کہ رو بن صاحب آتے ہیں کہ نہیں صبح سویرے بشیر سراج کا فون 4.45 پر آ گیا کیونکہ بشیر سراج سے میری پرانی دوستی ہے کیا ہوا اگر وہ انگلینڈ میں مقیم ہو گیا ہے اور میں ابھی تک پاکستان ہی میں ہوں اصل میں اگر میں پاکستان سے باہر کسی یورپی ملک میں مقیم ہونا چاہتا تو کب کا ہو گیا ہوتا۔مگر ملک کی زرخیز مٹی اور حب الوطنی نے مجھے اپنے حصار میں جکڑے رکھا جس کی وجہ سے میرے بچے آج تعلیم اور شعور کی منزلیں طے کر رہے ہیں اگر میں ایسا کرتا تو پھر میرے بچے آج جس مقام پر کھڑے ہیں یہ کبھی نہ ہوتے میں نے اپنی ذاتی ترقی کی بجائے اپنی فیملی کی ترقی کی طرف توجہ دی ہے یہی وجہ ہے کہ میری فیملی نے اس حد تک تو ترقی نہیں کی جو میں چاہتا تھا لیکن پھر بھی کہیں بہتر ہے بشیر سراج کے ساتھ وہ گزرے ہوئے لمحات ابھی تک جب بھی ہم کبھی ملتے ہیں یا فون

پر بات کرتے ہیں تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے ہم اسی نوعمری کے زمانے میں دوبارہ سے لوٹ آئے ہیں وہی پرانے قصے کہانیاں پرانی لوسٹوریاں دھراتے دھراتے صبح کے 7.00 بج گئے اور ہمیں احساس تک نہیں ہوا اس دوران بشیر سراج نے جب بچوں کا حال چال پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ میں تو پاکستان میں گھر پر موجود نہیں ہوں میں اس وقت اپنی کتاب چن سورج تے تارے کی تقریب رونمائی کے سلسلے ملائیشیاء آیا ہوا ہوں میں نے ابھی یہ بات کی ہی تھی کہ بشیر سراج چونک کر بولا کہ اتنی دور میں نے کہا کہ جناب یہ کچھ خدا کی طرف سے کرم نوازی ہے کہ یہاں پر بھی میرے چاہنے والے کچھ دوست ہیں ان کی خواہش پر یہ تقریب منعقد کروائی جا رہی ہے ورنہ میری کیا اوقات بشیر سراج بہت خوش ہوا اور مجھے ایڈوانس مبارک باد بھی دی پھر بشیر سراج نے مجھے کہہ ڈالا کہ یار کبھی ایک دفعہ انگلینڈ آجاؤ تو مزہ آجائے میں نے مذاق مذاق میں اسے کہا کہ جناب میں کیسے انگلیڈ آسکتا ہوں اس نے کہا کہ آپ آنا چاہو تو میں اس وقت اس پوزیشن میں ہوں کہ آپ کو سپانسر لیٹر بھیج سکتا ہوں میرے سپانسر لیٹر پر آپ کا ویزہ لگ سکتا ہے یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ اسی رات میرے بہت قریبی دوست پادری فراز ملک سے بھی فون پر بات ہوئی تھی اور رونمائی کا سن کر وہ نہ صرف حیران بلکہ خوش بھی ہوئے تھے ساری رات تو جاگتا رہا اور صبح جب 10.00 بجے سوکر جاگا تو سورج دیکھ کر فوراً باتھ روم میں جا گھسا کیونکہ LUNKAWI کا پروگرام بنانے کے لئے روبن صاحب نے 11.00 بجے آنا تھا بعد از انتظار 11.30 بجے ناشتہ کیا اور 12.00 بجے روبن صاحب کا فون آیا تو میرا دل خوش ہو گیا کہ چلو روبن صاحب آگئے ہیں سفر کا مقصد پورا ہو جائے گا اصل میں میں چاہتا تھا کہ محمود صاحب اور ان کی فیملی بھی میرے ساتھ لنکاوی چلیں گے تو کمپنی اچھی رہے گی میرے خیال میں تھا کہ محمود صاحب شائد اخراجات سے بہانہ کر رہے ہیں اس لئے میں ان کا یو این او کی ریکاوٹ کا خود پتہ کرنا چاہتا تھا کہ یہ بات کہاں تک سچ ہے میں محمود صاحب، ان کی اہلیہ اور میری بیگم صاحبہ روبن صاحب کے ساتھ ایرٹکلنگ کے آفس گئے اور سب سے پہلے میں نے ایرٹکٹینگ کاونٹر پر بیٹھی خاتون سے یہی سوال کیا کہ کیا یو این او کے کارڈ ہولڈر رفیوجیز جہاز پر واقعی سفر نہیں کر سکتے جب اس خاتون نے انکار کیا تب جا کر مجھے یقین ہوا کہ محمود صاحب واقعی بات درست کہتے ہیں ان کی مجبوری سمجھتے ہوئے میں نے محمود صاحب سے کہہ دیا کہ اگر بائی روڈ آپ جاسکتے ہیں تو میں بھی بائی روڈ چلا جاؤں گا پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ بائی روڈ لنکاوی جانے کے لئے تقریبا، 6 سے 7 گھنٹے روڈ کا سفر ہے جبکہ 3 سے 4 گھنٹے سمندر فریری کا سفر ہے اس طرح کیونکہ 10 گھنٹے بائی روڈ کے لئے ٹائم درکار تھا اور میرے پاس ٹائم کی کمی ہونے کے باعث فیصلہ ہوا کہ ہم دونوں میاں بیوی ہی جہاز کے ذریعے LUNKAWI جائیں گے ٹکٹ اور فلائٹ کا وقت پتہ چلا کہ یہ تو آج ہی کے روز شام کے وقت سب سے آخری فلائٹ ایرواشیا 7.45 بجے رات جائے گی جس کا کرایہ 400 رینگرڈ ریٹرن ٹکٹ ہوگا میں نے فوراً پیسے نکال کر دیئے اور ٹکٹ لے کر فوراً گھر پہنچتے ہی بیگم کو تیاری کا کہہ دیا کہ شام کے وقت ہم نے ایر پورٹ پر پہنچنا ہے۔ فوراً تیار ہو جاؤ بیگم نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا بھائی محمود وغیرہ نہیں جائیں گے میں نے کہا کہ میں نے تو پوری کوشش کی ہے کہ یہ ہمارے ساتھ چلیں مگر ہماری اور ان کی فیملی کے سفر کی لکیروں کے راستے الگ الگ ہیں ہماری قسمت میں نہیں کہ ہم ایک ساتھ سفر کر سکیں بیگم نے کہا کیا مطلب میں نے کہا کہ میں نے جہاز کے ٹکٹ کے لئے آفر کر دی تو ان کی یو، این، او کی پروبلم آڑے آگئی اور اگر میں نے ان کا ساتھ لینے کے لئے بائی روڈ جانے کا کہا تو وہ سفر 10 گھنٹے کے قریب پڑتا ہے جو کہ ہمارے لئے وقت کی کمی کے باعث مشکل ہے اس امید کے ساتھ کہ جہاز میں کچھ کھانے کے لئے مل جائے گا مسز محمود نے کھانے کی بجائے چائے تیار کر دی ہم سب نے مل کر چائے پی اور ہمارے سفر کے لئے دعائے خیر بھی کی میں نے جب اپنے فون میں لوڈ دیکھا تو مجھے یوں لگا کہ میرے پاس لوڈ کم ہے اور ابھی مجھے جانے سے پہلے LUNKAWI میں مقیم میرے بیٹے ارسلان یونس کے دوست مسٹر ریحان جو کہ والٹن لاہور کینٹ پاکستان کا رہائشی ہے اور اب کاروبار کے سلسلے میں LUNKAWI میں مقیم ہے اسی طرح مسٹر پرویز جو کہ فیصل آباد کا رہنے والا ہے اور روزگار کے لئے جو کہ LUNKAWI میں مقیم سمندر بیچ پر جاب کرتا ہے کو فون بھی کرنا تھا چنانچہ میں عبدیہ کو پیسے دیئے اور کہا کہ بیٹا میرے فون میں لوڈ یا کارڈ فیڈ کروا دو کیونکہ مجھے وہاں پہنچ کر بھی فون کرنا پڑے گا ایسا نہ ہو کہ میں وہاں ایر پورٹ پر لوڈ یا پھر کارڈ ڈھونڈتا رہوں اس نے فوراً مجھے لوڈ فیڈ کروا دیا اور اتنے میں مسٹر وقاص محمود نے ایر پورٹ جانے کے لئے کمپنی کی پرائیوٹ ٹیکسی

نمبر BMS.5352 منگوادی ہم نے اپنی ضرورت کے مطابق ایک بیگ میں کپڑوں کے علاوہ اپنی ضرورت کی اشیا اور کچھ سامان کے علاوہ اپنا کمپیوٹر بیگ ساتھ لیا جبکہ باقی اٹیچی کیس اور بیگ محمود صاحب کے ہاں ہی رہنے دیئے کیونکہ ہمیں کتاب کی رونمائی کے سلسلے میں واپس یہیں پر آنا تھا اور ہم ٹھیک 4.15 پر اپنے سفر کے لئے روانہ ہو گئے جہاز کی روانگی کا ٹائم 7.40 بجے شام کا تھا اور ہمیں کم از کم 2 گھنٹے پہلے پہنچنا ضروری تھا پھر بھی ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں 5.45 پونے چھ بجے شام ایر پورٹ پر پہنچا دیا میں نے اپنا کمپیوٹر بیگ اور بیگم نے دوسرا بیگ اٹھایا اور ایر پورٹ کے اندر پاسپورٹ اور سامان چیک کروانے کے لئے چلے گئے یہاں پر انٹرنیشنل کوالالپور ایر پورٹ ٹرمنل نمبر 2 ہونے کی وجہ سے مجھے پھر پہلے دن والی پروبلم پیش آئی کہ زبان کا پہلا مسئلہ پھر یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کس طرف کو جانا ہے دوسرے مسافروں کا پیچھا کرتے جا رہے تھے کہ یونیفام میں ملبوس ایک ملازم سے پوچھا تو اس کو انگریزی اور ہمیں ملائی نہ آنے کی وجہ سے نہ ہم اسے سمجھ سکے اور نہ وہ ہمیں میں ایک دم سامنے لگے انفرمیشن کاونٹر پر گیا اور وہاں کھڑی خاتون آفیسر سے اگلے مرحلے کا پوچھا تو اس نے ہمیں بتانے کی بجائے ہمارے پاسپورٹ لے کر ہمیں کمپیوٹر سے بورڈنگ پاس نکال دیئے اگلے کاونٹر پر ہم نے اپنا سامان بک کروا دیا اور اس سے آگے ہم اپنے بیگ ،ہینڈ بیگ اور دیگر وہ سامان جس میں دھات کا استعمال ہوا ہو مشین میں رکھ کر خود آگے نکل گئے سامان کلیر ہونے پر ہم نے اپنا سامان لیا اور لابی میں گیٹ نمبر 6 کی طرف چل دیئے الیکٹرک مشین پر چلتے ہوئے ہم مطلوبہ گیٹ کے سامنے جو کہ بوڈنگ کے لئے ابھی کھلا نہیں تھا دوسرے مسافروں کے ساتھ بیٹھ گئے 7.40 پر جہاز کا ٹائم تھا اور 6.55 چھ بج کر پچپن منٹ پر مسافروں کے لئے گیٹ کھولا گیا تو فوراً مسافروں کی لمبی قطار نہ جانے کہاں سے لگ گئی کیونکہ اس سے پہلے ایسے لگ رہا تھا کہ اسکے علاوہ LUNKAWI جانے والی ایروایشیاہ کی فلائٹ میں یہ تھوڑے سے مسافر ہی جائیں گے بوڈنگ پاس دیکھا کر ہم بھی اپنی باری پر جہاز میں جا کر بیٹھ گئے 7.40 سات بج کر چالیس منٹ پر جہاز اپنی پرواز کے لئے تیار تھا جونہی جہاز رن وے کی طرف بڑھ رہا تھا تو ایر ہوسٹس نے اپنی ڈیوٹی پوری کرتے ہوئے مسافروں کے درمیان پرواز میں احتیاطی تدابیر بھی بتائیں اور LUNKAWI کا درجہ حرارت اور ٹائم بھی بتا دیا۔ جہاز کے رن وے سے اڑان لیتے ہی ایک جھٹکا سا محسوس ہوا تو جہاز دیکھتے ہی دیکھتے جب اپنی حد اونچائی تک پرواز کرنے لگا تو میں نے کیونکہ دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا تھا اس لئے بھوک شدت اختیار کر گئی اب میں نے اپنی بیگم سے تو پوچھا نہیں تھا کم از کم میں اس انتظار میں تھا کہ کب کوئی ایر ہوسٹس آئے اور ہمیں کچھ کھانے پینے کے لئے دے اب تو ہم آدھ گھنٹے سے زیادہ کا سفر طے کر چکے تھے جبکہ ٹوٹل سفر کا ٹائم 1.15 ایک گھنٹہ پندرہ منٹ تھا بھوک اور انتظار کتنے ہی ظالم ہوتے ہیں یہ دونوں ستائے بغیر نہیں رہ سکتے جو مجھے دونوں ہی بڑی سدت سے ستائے جا رہے تھے اور دوسری طرف ایر ہوسٹس تھیں کہ آنے کا نام نہیں لے رہی تھیں اچانک میری نظر دو ایر ہوسٹسوں پر پڑی تو وہ کھانے والی ٹرالی کے ساتھ ہماری ہی طرف بڑھتے چلی آ رہی تھیں مجھے حوصلہ سا ہو گیا کہ ابھی باری آنے تک میرے کھانے یا کم از کم پینے کے لئے کچھ آ جائے گا جبکہ چند ہی منٹوں میں وہ دونوں ایر ہوسٹس میرے پاس سے ایسے گزر گئیں جیسے تیز ہوا کے ساتھ زمین پر گرے درختوں کے سوکھے پتے غائب ہو جاتے ہیں میں نا صرف حیران ہوا بلکہ پریشان بھی کہ انھوں نے درمیان کے سارے مسافر کیوں چھوڑ دیئے اس کے باوجود میں پر امید تھا کہ وہ اگلے مسافروں کو دے کر میرے پاس دوبارہ سے آئیں گئیں میرا دل اس وقت نا امید ہوا جب جہاز کی خدمت گزار اپنے کیبن میں پہنچ گئیں اور جہاز کے کپتان نے اناونس کیا کہ ابھی ہم تھوڑی ہی دیر میں اپنی منزل مقصود LUNKAWI ایر پورٹ پر اترنے والے ہیں آپ تمام مسافروں سے درخواست ہے کہ اپنی اپنی سیفٹی بیلٹ باندھ لیں آپ کا ہمارے ساتھ ایک گھنٹہ پندرہ منٹ سفر اور تعاون کرنے کا شکریہ تھوڑی ہی دیر میں جب 8.50 آٹھ بج کر پچاس منٹ پر رات جہاز نے LUNKAWI ایر پورٹ پر لینڈ کیا تو دروازے کھلتے ہی ایر ہوسٹس حسب روایت دروازوں پر کھڑے ہو کر مسافروں کو خیر باد کہتی رہیں ابھی ہم اپنا سامان سیدھا ہی کر رہے تھے کہ میرے بیٹے ارسلان کے دوست ریحان کا فون آ گیا کہ انکل آپ آ گئے ہیں تو میں لابی میں آپ کا ویٹ کر رہا ہوں میں نے اسے جواب دیا کہ ہم آ رہے ہیں آپ ہمارا ویٹ کریں ہم نے اپنا سامان لیا اور جہاز کے ساتھ لگی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر پیدل ہی لابی میں آ گئے اور چاروں طرف ریحان کو ڈھونڈنے لگے اس وقت پہلے میں نے اپنی بیگم کی کچھ تصاویر بنائیں ابھی ہم

تصاویر بنا ہی رہے تھا کہ ریحان نے ہمارے پاس آتے ہی جھک کر کہا انکل انٹی اسلام وعلیکم میں بڑا حیران ہوا کہ اس نے ہمیں پہچان کیسے لیا کہ ہم ہی اس کے پاس آئے ہیں یا پھر ہم ہی ارسلان کے ماماں پاپا ہیں میں نے زیادہ سوچنے سے پہلے ہی ریحان کو پوچھ لیا کہ بیٹا یہ تو بتاؤ کہ تم نے فوراً ہمارے پاس ہی آ کر ہمیں سلام کیا ہے کیسے پہچانا تو اس نے مجھے جواب دیا انکل ہمارا روز کا کاروبار ہے ایر پورٹ سے مختلف ممالک کے مسافروں کو لے کر جانا اور بطور ٹیورسٹ انھیں اپنی سروسز دینا۔ اور پھر آپ تو میرے ہی ملک کے میرا ہی خون ہیں آپ کو بھلا میں کیسے نہ پہچان پاتا اس کی اس بات پر میں خاموش ہو گیا اس وقت میری بیگم خاموش میری اور ریحان کی باتیں سنتی رہی ہم اس کے ساتھ باہر کھڑی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے بیٹھتے ہی ہم نے ایک دوسرے کا حال پھر ارسلان اور پھر اس نے پاکستان کا حال چال پوچھا تو میں نے سب اچھے کی رپورٹ دے دی تو کوئی 25,30 پچیس سے تیس منٹ کی مسافت کے بعد وہ گھر آ گیا جو ریحان بیٹے نے LUNKAWI میں ہمارے قیام کے دوران ہمارے لئے تیار کروایا تھا پہلے ہم نے کمرے میں اپنا سامان رکھا اور ریحان نے کمرے کی چابی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ انکل جی یہ گھر کی چابی ہے گھر آپ کے حوالے آپ جب تک چاہیں اس میں رہ سکتے ہیں اس گھر میں تمام سہولتیں موجود ہیں اگر پھر بھی کوئی پریشانی ہو تو میرے فون نمبر پر آپ 24 گھنٹے مجھے کال کر سکتے ہیں میں نے اسے کہا کہ یار اس وقت سخت بھوک لگی ہے یہاں کوئی ہوٹل ہے تو کھانے کے لئے کچھ لے آتے ہیں اس نے کہا یہاں پر تھوڑی دور آگے ایک ہندوستانی ہوٹل ہے وہاں سے کچھ لے آتے ہیں ہم کوئی 9.30 ساڑھے نو بجے رات ہوٹل پر گئے اور ریحان نے کہا کہ نان لے لیتے ہیں یہاں پر نان کے ساتھ دال فری میں دیتے ہیں میں نے فوراً سوچا کہ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اور اوپر سے پاکستانی مفت کی دال برتن نہ ملے تو جوتے ہی میں ڈلوا لیتے ہیں میں نے فوراً ہاں کر دی کہ ٹھیک ہے چار نان لے لیتے ہیں اس کے ساتھ ایک بوتل پانی ساتھ ہی سٹور سے ایک بڑی ڈبل روٹی چھ عدد انڈے اور ایک عدد سیبوٹی خرید کر ہم واپس آ گئے جب ہم نے گھر کا دروازہ کھول لیا تو ریحان نے ہمیں خدا حافظ کہتے ہوئے کہا کہ میں صبح 9.15 نو سے سوا نو بجے تک آؤں گا سیر پر جانے کے لئے تیار ہو جایئے گا یہ کہہ کر ریحان اپنے گھر چلا گیا اور ہم دونوں میاں بیوی پورے چار بیڈ کے گھر میں کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر ٹی وی دیکھتے رہے کیونکہ میری بیگم کی عادت جلدی سونا ہے اس لئے خدا سے شکرانے کی دعا کرنے کے بعد وہ تو سو گئیں اور میں رات 4 بجے تک دوستوں میں سے فادر مختار عالم کے ساتھ فون پر باتیں کرتے کرتے نا جانے کب سو گیا۔

نامور شاعر، سیرت نگار اور محقق

تفاخر محمود گوندل کا نعتیہ مجموعہ

تقدیس

مکمل اہتمام سے شائع ہو گیا ہے

ناشر: **نستعلیق مطبوعات**، اُردو بازار لاہور

لبنیٰ صفدر/ لاہور

غریبوں کو گھٹا مہنگی پڑی ہے
کہ بارش کی دعا مہنگی پڑی ہے
زمانہ بن گیا ہے سارا دشمن
محبت کی خطا مہنگی پڑی ہے
سبھی دروازے مجھ پر ہو گئے بند
ترے در پر صدا مہنگی پڑی ہے
جلایا بھی بجھایا بھی اُسی نے
چراغوں کو ہوا مہنگی پڑی ہے
اُسی کی انتہا اچھی ہوئی ہے
وہ جس کی ابتدا مہنگی پڑی ہے
نظر آنے لگے ہیں داغ لبنیٰ
قباؤں کو ضیا مہنگی پڑی ہے

....

ڈھول سے تھیں اٹی ہوئی آنکھیں
تم سے مل کر نئی ہوئی آنکھیں
کیسے جاؤں گی اُٹھ کے گھر اپنے
یہ تری روکتی ہوئی آنکھیں
ایک پل میں ترا ہوا یہ دل
ایک پل میں تری ہوئی آنکھیں
بات کرنے کی ہے مجال کہاں
ہائے وہ بولتی ہوئی آنکھیں
دیر سے پاس بیٹھے ہیں دونوں
سپنوں سے ہیں بھری ہوئی آنکھیں
تیرے ہوتے بھی تجھ کو ڈھونڈتی ہیں
اس طرح باوری ہوئی آنکھیں
سونے دیتی نہیں مجھے لبنیٰ
اُس کی وہ جاگتی ہوئی آنکھیں

عامر بن علی: اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیے۔

غلام حسین ساجد: میں اردو اور پنجابی ہر دو زبانوں میں ایک جیسی سہولت سے لکھتا ہوں۔ اردو کے نو (''موسم''، ''عناصر''، ''کتابِ صبح''، ''آئندہ''، ''معاملہ''، ''روداد''، ''نیند میں چلتے ہوئے''، ''چہار دریا''، اور ''اعادہ'' پنجابی کے ساتھ ''دنیا پھرے غمازی''، ''پانی رمز بھرے''، ''بیلے وچ چڑیاں''، ''سرسوتی توں راوی تائیں بانئے''، ''کسے سفنے دے نال'' اور ''مونجھ اُسارے محل''، شعری مجموعوں کے علاوہ ''مہاندرے'' (خاکے)، نیندر بھنی رات (کہانیاں) اور تائید (تنقید) میری طبع زاد کتابیں ہیں۔ چار مرتبہ کتابیں ''نئی پاکستانی نظم، نئے دستخط'' (دہلی، بھارت؛ ''نئی پاکستانی غزل، نئے دستخط'' (دہلی بھارت/ لاہور پاکستان) اور ''اردو شاعری کلاسیکی عہد میں''، ''اردو ادب بیسویں صدی میں'' ان کے علاوہ ہیں اور الحمدللہ تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

عامر بن علی: آپ نثر نگار بھی ہیں، شاعر بھی۔ شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

غلام حسین ساجد: عامر صاحب! نثر ہو یا نظم یہ دونوں اظہار کے وسیلے ہیں اور موضوع ہی اپنے لیے ہیئت اور اظہار کے سانچے کا انتخاب کرتا ہے۔ مرے نزدیک لکھنے والوں کی حیثیت معمول سے زیادہ کی نہیں۔ غزل، نظم، افسانہ یا اور کوئی صنف محض موضوع کو ایک بصری جامہ دینے کا وسیلہ ہے۔ اس لیے مجھے نثر اور نظم یکساں مرغوب ہیں کہ میرے کل کا اظہار کسی ایک اظہاری سانچے پر قانع ہو کر تکمیل پا ہی نہیں سکتا۔ بس میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ نثر ہو یا نظم۔ اسے زیادہ سے زیادہ بلیغ اور بامعنی بنا سکوں اور اپنے باطنی احساس کو ضعف پہنچائے بغیر قاری تک منتقل کر سکوں۔

عامر بن علی: الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟ آپ کی رائے؟

غلام حسین ساجد: یہ دوری عارضی اور غیر حقیقی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ترقی پسند ممالک میں کتاب کے سلسلے میں الیکٹرانک میڈیا پر انحصار کم ہو رہا ہے اور اگر نہ بھی ہو تو اس سے ادب کے قاری میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ کیوں کہ میڈیا کی اس نوع کی رسائی آپ کی خلوت میں، آپ کے حجرے اور آرام گاہ کی تاریکی تک ہونے پر بھی، کتاب کی ضرورت، اس کی افادیت، ہمہ گیری اور قرب اور دوری میں کسی مصنوعی وسیلے سے آزاد رفاقت کی وجہ سے ہمیشہ قائم رہے گی۔

عامر بن علی: آپ نے کبھی اپنی ادبی پروجیکشن کے لیے کچھ نہیں کیا۔ الیکٹرانک میڈیا کے مشاعرے ہوں یا بین الاقوامی مشاعرے۔ آپ مدعو ہونے کے باوجود شریک نہیں ہوتے۔ اس بے نیازی کی وجہ؟

غلام حسین ساجد: صاحب اس میں زیادہ ہاتھ مری کاہلی کا ہے جو اب آہستہ آہستہ ''سو کالڈ بے نیازی'' بن گئی ہے۔ یوں بھی میں مشاعرے کا آدمی نہیں اور ادب کے معاملے میں خوشامد اور رواداری سے کام لینا بھی میرے بس سے باہر ہے۔ سو اپنی کھال میں مست رہنے میں عافیت جانتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ آخری فیصلہ کام اور آپ کی تخلیق کے معیار پر منحصر ہے۔ ہزاروں معروف اور محبوب لکھنے والے آج ذہن پر زور دے کر بھی یاد نہیں آتے کہ ان کے کام کی نوعیت ہنگامی اور عارضی تھی۔ میرے خیال میں لکھنے والے کو اپنی ذات اور تخلیقی بصیرت پر اعتماد کرنا چاہیے اور میں ایسا ہی کچھ کرنے کی سعی کرتا ہوں۔

عامر بن علی: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

غلام حسین ساجد: تخلیقیت کی کئی پرتیں ہیں۔ یہ مستقبل بینی بھی ہے اور گزرے وقت کے اسرار کی طلسمی بازیافت بھی۔ زندگی اور وقت کی بوقلمونی کا اظہار بھی اور وجود اور لاوجود کی حقانیت کا ظہور بھی۔ یہ موجود اور غیر موجود کے ہونے اور اس سے تعلق اور عدمِ تعلق کی شگفت بھی ہے اور فکر اور خیال کی ندرت کا مرکزہ بھی اور ایک اچھے تخلیق کار کا کام اس شعلہ مستعجل کو اُس کی تمام تر صباحت کے ساتھ دوام دینا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر بڑے اور اچھے تخلیق کار کے یہاں وقت ایک حرکی قوت بن کر ظاہر ہوتا ہے اور تجربہ ایک مثالی منظر بن کر ٹھہر نہیں جاتا بلکہ ہمیشہ فعال اور تازہ رہتا

ہے۔ سو میرے نزدیک ایک اچھا تخلیق کار وہ ہے جو اپنی تخلیق میں دوامی جہت پیدا کرنے پر قادر ہو اور اس کی تخلیق زمانی شکنجے سے آزاد اور خود رو ہو۔

عامر بن علی: کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

غلام حسن ساجد: ایسے کسی لمحے کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ پہلے شعر کی تخلیق کا لمحہ، پہلی کتاب کی اشاعت، پہلی تخلیق کی اشاعت، پہلے بچے کی پیدائش، اپنے بیٹے کے یہاں پہلی اولاد کی پیدائش، پہلے وصل اور پہلے ہجر کی آزمائش۔ غرض سینکڑوں لمحے ہیں جو اہم بھی ہیں اور یادگار بھی۔ یوں کہیے کہ مجموعی طور پر میں آسودگی اور شکر سے بھرا ہوا آدمی ہوں اور اس پر خالق کا جس قدر بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

عامر بن علی: مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے۔ کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

غلام حسین ساجد: مشاعروں کی تہذیب کے بارے میں اقبال نے کم و بیش ایک صدی پیشتر فرمایا تھا ''اردو شاعری کو جو نقصان مشاعروں نے پہنچایا ہے کسی اور نے نہیں پہنچایا'' اور اس کی توضیح یہ ہے کہ مشاعرہ میں سنائی جانے والی شاعری مشاعرے کے سامعین کے ذوق کی تسکین اور فہم کی سطح سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ آج کے عہد میں یہ سطح اور بھی نیچے آ گئی ہے اور اس کا سبب مشاعروں کے منتظمین ہیں جو ذوقِ شعری کی پرداخت سے زیادہ سامعین کی انٹرٹینمنٹ کو اہم جاننے لگے ہیں اور بدذوقی اور پھکڑ پن کی سطح پر کی جانے والی شاعری کو مشاعرے کی کامیابی کا سبب جاننے لگے ہیں۔ آج سے نصف صدی قبل مشاعرے میں مزاحیہ کلام کا سنایا جانا بدذوقی کی علامت تھا اور الگ مزاحیہ مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے۔ مگر اب انہیں مشاعرے کی کامیابی کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ خواہ وہ ''ابا، ڈبا اور ہبا'' کی سطح کا پھکڑ پن ہی کیوں نہ ہو۔ ذاتی طور پر میں مشاعرے کے کلچر ہی کا قائل نہیں اور آج کل برپا ہونے والے مشاعروں کو محض ایک ''ثقافتی شو'' جانتا ہوں۔

عامر بن علی: کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ہوتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا اندرون سے؟

غلام حسین ساجد: دونوں سے۔ ادب کسی نہ کسی سطح پر اپنے عہد اور سماج سے جڑا ہوتا ہے۔ میں نے اکادمی ادبیات پاکستان کے ایک مذاکرے میں ''پاکستانی ادب'' کی تعریف کے سلسلے میں عرض کیا تھا کہ ''پاکستانی ادب وہ ہے جو کسی بھی زبان میں پاکستان کی حدود میں لکھا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ لکھنے کی تحریک باطنی ہو تب بھی اس کی نسبت بیرون سے ہوتی ہے اور اس مٹی اور معاشرے سے، جس پر اور جس میں آپ موجود ہیں۔ یہ ادب زمینی رشتوں کی دین ہے۔ مگر آپ اظہار کے لمحے سے اس رشتے سے آزاد یا ماورا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دائمی حقیقتوں کا ظہور ہمیشہ زمینی صداقتوں کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ سو بڑے ادب میں ظاہر اور باطن کا ادغام لازمی ہے۔

عامر بن علی: آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

غلام حسین ساجد: بہت اہم اور کارگر۔ بشرطے کے سوشل میڈیا ادب کے فروغ میں واقعی اپنا کردار سنجیدگی سے ادا کرے۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنی رسائی اور اثر کے لحاظ سے سوشل میڈیا کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور یہ ادب کی ترویج میں بے حد معاون اور فعال کردار ادا کر سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے ہمیں اپنی فکر اور ترجیحات کو بدلنا ہوگا اور یہ طے کرنا ہوگا کہ ہم اپنے معاشرے کو کس سمت میں لے جانا چاہتے ہیں اور اس تبدیلی میں ادب کا کردار کیا ہونا چاہیے؟

عامر بن علی: ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

غلام حسین ساجد: بڑی حد تک..... ادیب کی انفرادیت اس کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کے تخلیقی اظہار سے ظہور کرتی ہے۔ اس لیے تخلیق کسی بھی شخص کی ذات کا آئینہ ہوتی ہے۔ خصوصی شعری روایت میں ندرت کا بیج ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہی پھوٹتا ہے۔

عامر بن علی: کیا کھویا، کیا پایا؟

غلام حسین ساجد: کسی شاعر نے کہا تھا:

قطرہ دریا ہے، اگر اپنی حقیقت سمجھے
کھوئے جاتے ہیں جو ہم آپ کو پا جاتے ہیں

میں نے بھی اپنے آپ کو کھو کر اپنے آپ کو پایا اور اس پر اپنے خالق کا بے حد شکر گزار ہوں۔

شاعری

ادھر کے ستارے اُدھر ہو رہے ہیں
بلا کے اشارے اُدھر ہو رہے ہیں
ادھر دشمنوں کی ہے چشمِ عنایت
کہ ساتھی ہمارے اُدھر ہو رہے ہیں
ادھر منہ پھلائے ہوئے لوگ ہوں گے
کہ کیسی غبارے اُدھر ہو رہے ہیں
ادھر کے کنارے پہ بھی ہیں وہ قابض
کہ دونوں کنارے اُدھر ہو رہے ہیں
ادھر دیکھتے ہوں گے دلدوز منظر
کہ دلکش نظارے اُدھر ہو رہے ہیں
ادھر آنکھ میں چند جگنو ہیں روشن
سبھی چاند تارے اُدھر ہو رہے ہیں
ادھر فاقہ ماروں کی بیچارگی ہے
مگر عیش سارے اُدھر ہو رہے ہیں
ادھر ہم اکیلے اکیلے رہیں گے
سبھی جاں سے پیارے اُدھر ہو رہے ہیں
ادھر نفرتوں مارے ساتھی ہیں اپنے
محبت کے مارے اُدھر ہو رہے ہیں
ادھر ہوتے جاتے ہیں بے آسرا ہم
مگر سب سہارے اُدھر ہو رہے ہیں
ادھر رُوحی اپنے ہیں سارے خسارے
مگر نغمے سارے اُدھر ہو رہے ہیں

رُوحی کنجاہی/لاہور

رباعیات

دیکھے جو کوئی موج مچل جاتا ہے
طوفان بلاخیز میں ڈھل جاتا ہے
دریا سے جو گرتا ہے سمندر میں کبھی
پانی کا مزاج ہی بدل جاتا ہے

....

چھیڑے جو اُسے ہوا تو شرماتی ہے
تنہائی کے احساس سے گھبراتی ہے
جب اُس سے کوئی ادا سے کرتا ہے کلام
نادیدہ خیالات میں کھو جاتی ہے

....

جینے پہ بھی اصرار نہیں ہے مجھ کو
مرنا بھی کوئی عار نہیں ہے مجھ کو
مر جانے کے بعد پھر اُٹھایا جاؤں
کہہ دیجیے انکار نہیں ہے مجھ کو

....

مستور زمین و آسماں میں ہے وہی
احساس کے پردہ نہاں میں ہے وہی
تم ڈھونڈتے ہو کون و مکاں میں جس کو
آباد مرے دل کے مکاں میں ہے وہی

مظفر حسن منصور/خوشاب

میں سر کے بل گیا وہاں پاؤں کے باوجود
جلتا رہا ہوں دھوپ میں چھاؤں کے باوجود
کیا جانئے وہ کون سا جذبہ تھا، لے گیا
مجھ کو تمہارے در پہ اناؤں کے باوجود

رگ رگ میں زہرِ عشق مرے دوڑتا رہا
ردِّ بلا کی ساری دعاؤں کے باوجود
میرا بلندیوں کی طرف ہے سفر رواں
پرواز کب رکی ہے خلاؤں کے باوجود
محشر میں ڈھونڈتی رہیں مجھ کو شفاعتیں
میں معتبر ہوا تھا خطاؤں کے باوجود
سناٹے شور زن تھے وہاں اس قدر جلیل
آتا نہ تھا جواب صداؤں کے باوجود
اپنے لہو کی لو سے جلایا جنہیں جلیل
جلتے رہے چراغ ہواؤں کے باوجود

احمد جلیل/اوکاڑہ

میں اُس کے روبرو تھی اور وہ تھا
ہوا سے گفتگو تھی اور وہ تھا
کوئی تھامے طنابیں اسپ جاں کی
یہی اک آرزو تھی اور وہ تھا
کوئی واقف نہ تھا ان وحشتوں سے
وہ کیسی جستجو تھی اور وہ تھا
بدن میں چل رہی تھی سانس بن کر
محبت باوضو تھی اور وہ تھا
وہ جس نے جاں گنوائی آس اپنی
وفا کی آبرو تھی اور وہ تھا

آسناتھ کنول/لاہور

بنجر زمین کو ہے پھر انتظار دریا
رستہ بدل نہ جائے کیا اعتبار دریا

اُس بے وفا نے دیکھو، دیکھا نہیں پلٹ کر
روتی رہی محبت بیٹھی کنارِ دریا
ان کشتیوں میں بھیجو تم دھوپ چھاؤں بھر بھر
بستی خدا کی بستی، بستی ہے یارِ دریا
دریا کے پانیوں میں یوں اشک وخوں گلے میں
اے کاش سننے والے، سنتے پکارِ دریا
کہسار کی بلندی جھک جھک کے دیکھتی ہے
کیسے رواں دواں ہے یہ آبشارِ دریا
یوں اس کے دم سے شاد و آباد بحر و بر ہیں
شمس و قمر سا مجھ کو لگتا ہے کارِ دریا
سیلِ رواں نے روندا اس خطہ زمیں کو
خلق خدا ہے گی کیسے یہ وارِ دریا

عرفانہ امر/گوجرانوالہ

وہ جو اک گل ہے بغیچے میں کسی خار کے ساتھ
میں اُسے دیکھتا رہتا ہوں بہت پیار کے ساتھ
دشت آباد کیا قیس نے لیلیٰ کے لیے
بیٹھ جاتا ہوں میں آ کر تری دیوار کے ساتھ
میرؔ صاحب نے سکھایا ہمیں مصرع کہنا
دل نے دنیا بھی دکھائی ہمیں دلدار کے ساتھ
ہم اُسے دعوتِ گریہ نہیں دینے والے
شغل ہے جس کو فقط درہم و دینار کے ساتھ
ہم فقط اُس کو سنائیں گے مناجاتِ عزا
جو کبھی بیٹھ کے رویا ہو عزادار کے ساتھ
پاؤں زنجیر سے نکلا ہے نہ اشک آنکھوں سے
ہم نے اس شہر کو دیکھا بڑے آزار کے ساتھ
بزم میں ذکر مرے یار کا نہیں تھا سو میں
آ گیا اُٹھ کے وہاں سے دلِ بے زار کے ساتھ
وہ مرے دل سے نکل کر بھی وہیں ہے موجود
جیسے اقرار پڑا ہو کہیں انکار کے ساتھ
ساتھ اس دل کے کوئی رنج لگا ہے ایسے
جیسے اک اور کہانی کسی کردار کے ساتھ
اُس کے پاؤں تھے کوئی جڑواں کبوتر کامیؔ
میں نے اک پھول بھی رکھا وہیں تلوار کے ساتھ

سیّد کامی شاہ/کراچی

شب فراق نے پائیں جو قربتیں اُس کی
کلی کلی نے چرائیں نزاکتیں اس کی
زمیں پہ بیٹھ کے تھوکے گا آسمان پے وہ
پڑیں گی اُس کے ہی چہرے پے لعنتیں اُس کی
نظر ملانا، چرا کر نظر گزر جانا
ہیں نقش دل پے ہمارے شرارتیں اُس کی
ذرا سا ٹھہر اَجل کے اُسے میں لوٹا دوں
جو میرے پاس پڑی ہیں امانتیں اُس کی
وہ بھول سکتا ہے وعدے شبِ جدائی کے
میں جانتا ہوں نہ بدلیں گی عادتیں اُس کی
مرے خلوص نے دریائے غم کو پار کیا
بہا کے لے گئیں اُس کو ضرورتیں اُس کی
اُسے ہو خوف سزاؤں کا کیوں بھلا شاہدؔ
وہ مدعی ہے، وہ منصف عدالتیں اُس کی

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

تیروں سے نہیں آنکھ سے جب وار کریں گے
پھر تم سے کوئی بحث نہ تکرار کریں گے
معلوم ہے آتے ہیں ترے خواب میں اکثر
اک دن تجھے خود آ کے بھی بیدار کریں گے
تسبیح بھی ہے ہاتھ میں، غیبت بھی زباں پر
کیا اس کے سوا اور ریاکار کریں گے
جو راز امانت کی طرح رکھنا ہے ان کو
وہ اس کو ہی افشا سرِ بازار کریں گے
اس عہد میں ہوتی ہے محبت کی تجارت
اُلفت کی خریداری بھی زردار کریں گے
اک روز اگر ان سے خفا ہو گئے ہم تو
خلوت میں نہ جلوت میں وہ دیدار کریں گے
جب پیار سبیلہؔ بنے اُنگلی میں انگوٹھی
ہم ان سے تبھی پیار کا اقرار کریں گے

سبیلہ انعام صدیقی/کراچی

(محمد اقبال پیام کے شعری مجموعے ”پھر وہی شام“ سے

ترے حُسن سے نسبتیں بڑھ گئی ہیں
کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر
اے عشق کا معجزہ ہی کہیں گے
قریب آ گئے وہ بہت دور ہو کر
ذرا اپنے دامن میں ہم کو چھپا لے
ترے پاس آئے ہیں مجبور ہو کر
وفا پر جو آمادہ ہوتے نہیں ہیں
رہے تیری محفل کا دستور ہو کر
نگاہ کرم جس پہ ڈالی نہ تو نے
پڑے ہیں وہی زخموں سے چور ہو کر
ہمارے سوا کون دیکھے گا ایسے
نظر میں رہے ہیں وہ مستور ہو کر
چلن ایسا بدلا پیامؔ آدمی نے
وفا رہ گئی آج کافور ہو کر

محمد اقبال پیام شجاع آبادی/لاہور

ناممکن

ہم کو اس محبت کے
دوسرے کنارے پر
تم ہی لے کے آئے ہو
بے رُخی کی موجوں نے
اجنبی تھپیڑوں نے
چاہتوں کی بستی کو
درد کے جزیرے پر
اس طرح اُچھالا کہ
اب اگر جو چاہو بھی
تم ہمیں بلاؤ بھی
درد کے جزیرے سے
ریزہ ریزہ ہستی کی
واپسی ناممکن ہے

تسنیم کوثر/ لاہور

چپ کی چادر

خواہشوں کے دیس میں
عزتوں کے بار کو
رکھ کے شانوں پر چلی
زندگی کے دشت میں
چپ کی چادر اوڑھ کر
صبر پلّو میں لیے
عمر بھر جیتی رہی
زہرِ غم پیتی رہی

تسنیم کوثر/ لاہور

عدیم الفرصتی

کئی دن سے
مجھے آواز دیتے ہیں
وہ رستے اور وہ گلیاں
جہاں گزرا مرا بچپن
بلاتے ہیں در و دیوار اس گھر کے
جہاں خوشبو بسی ہے میرے آبا کی
پکڑ کے اُنگلی والد کی جہاں سیکھا تھا چلنا
پہلی بار آنگن وہ مجھے آواز دیتا ہے
وہ کمرے جن کی خاموشی میں اب بھی لوریاں ہیں
اور تھپکی ماں کے ہاتھوں کی
مجھے آواز دیتے ہیں
کئی دن سے مرے خوابوں میں آتا ہے
مرے اسکول کا میدان جس میں کھیلتے تھے
دوست مل کے ہم
وہ سب اُستاد جن کے پیار، جن کی مار نے ہم کو
کسی قابل بنایا ہے
کئی دن سے مرے خوابوں میں آتے ہیں
محلے کے سبھی لڑکے
وہ میرے دوست اور بیلی
وہ جن کے ساتھ میرے روز و شب گزرے
کبھی آوارہ گردی
اور کبھی اک ساتھ پڑھنے میں
محبت میں شرارت میں
کبھی آپس میں لڑنے میں
وہ دو نہریں
وہ نہروں کے کناروں پر
درختوں کے گھنے سائے
مجھے آواز دیتے ہیں
وہ اسٹیشن جہاں پر یونہی جا کے
بیٹھا کرتے تھے
ٹرینیں اس پہ اب بھی آ کے رُکتی ہیں
مسافر اب بھی آتے اور جاتے ہیں
مگر اب ہم نہیں ہوتے
مسافر تھے سبھی ہم دوست اپنی اپنی راہوں کے
نہ جانے اب کہاں ہیں سب
کہ دل میں یاد مدھم سی ہے ان کی اب
کئی دن سے وہ میرا شہر منٹگمری
مجھے آواز دیتا ہے
مگر اُلجھا ہوں روز و شب میں کچھ ایسا
مجھے فرصت نہیں ملتی
کہ اپنے آپ سے جا کر
میں مل آؤں

افتخار شوکت/ لاہور

سالِ نو

نیا سال آیا ہے
یا تغیر نو کا
پیغام لایا ہے
ابھی تو طے نہیں ہے کہ
طے ہونا تو باقی ہے
تبدل ہوگا
تو کیا ہوگا
لفظ بدلیں گے
سال بدلے گا
تو کیا ہوگا
کہ سچ تو ہے
بدل جائیں
حالات ان کے
جو کسمپرسی میں رہتے ہیں
اُمید کے ساتھ جیتے ہیں
اگر کچھ بھی بدل جائے
سالِ نو کی تعبیر ہو جائے

آفتاب احمد/ لاہور

اس شہر کی غربت نے ستم توڑے ہیں کیا کیا
اک شخص کئی مرتبہ نیلام ہوا ہے

سعید پسروری

مختصر ادبی خبریں

- ✦ نامور علمی و ادبی شخصیت منو بھائی انتقال فرما گئے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
- ✦ ہری پور کی علمی و ادبی شخصیت محمد قاسم انتقال فرما گئے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
- ✦ پنجابی زبان کے مشہور شاعر نذیر احمد زید انتقال فرما گئے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
- ✦ پنجابی کے ممتاز شاعر رفاقت حسین ممتاز نہ رہے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
- ✦ ممتاز ادیب، ماہر لسانیات اور مترجم شاہد حمید وفات پا گئے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
- ✦ ممتاز بزرگ صوفی شاعر بشیر ناطق شدید علیل ہیں۔
- ✦ سینئر اینکر اور تجزیہ نگار حسن نثار کی والدہ محترمہ وفات پا گئیں۔۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
- ✦ ساہیوال کے معروف شاعر غضنفر عباس سیّد وفات پا گئے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
- ✦ دنیائے ادب کی جانب سے محترمہ سیما غزل صاحبہ کے اعزاز میں ایک شام سجائی گئی۔ دنیائے ادب اور آرٹس کونسل ادبی کمیٹی نے کراچی میں اس کا اہتمام کیا۔
- ✦ حسب روایت ایکسپو سنٹر لاہور میں سالانہ کتاب میلہ سجایا گیا۔
- ✦ گوجرانوالہ میں معروف شاعر علی یاسر کے دوسرے شعری مجموعے ''غزل بتائے گی'' کی تقریب پذیرائی بلدیہ ہال میں منعقد ہوئی۔
- ✦ کل پاکستان محفل مشاعرہ بھکر میں منعقد ہوا جس میں ملک بھر سے نامور شعرا نے شرکت کی۔ اس کے انعقاد میں نامور شاعر منصور آفاق نے کلیدی کردار ادا کیا۔
- ✦ اعجاز اللہ ناز کے ساتھ شام اکادمی ادبیات گلبرگ لاہور میں منائی گئی۔
- ✦ ممتاز راشد لاہوری کے اعزاز میں ''ملتان لٹریری کلب'' اور خانہ فرہنگ ایران کے اشتراک سے تقریب منعقد ہوئی۔
- ✦ ادارہ خیال و فن کے زیر اہتمام پروفیسر محمد عباس مرزا کے اعزاز میں لاہور میں تقریب کا انعقاد کیا گیا۔
- ✦ بزرگ شاعر، سفرنامہ نگار اور کالم نگار اختر ہاشمی کے اعزاز میں تقریب لاہور میں منعقد ہوئی۔
- ✦ ''آل پاکستانیز اوور سیز آرگنائزیشن انٹرنیشنل'' کے زیر اہتمام پاکستانی نژاد جاپانی سیاح، سفرنامہ نگار ادیب اور صحافی ناصر ناکا گاوا کے سفرنامہ ''دیس دیس کا سفر'' کی تقریب پذیرائی بحرین میں منعقد ہوئی۔
- ✦ بیادِ غالب مشاعرہ بیکن ہاؤس میں منعقد ہوا۔
- ✦ نعت اکیڈمی فیصل آباد کے زیر اہتمام تیسری سالانہ کل پاکستان محفل نعت کا اہتمام کیا گیا جس میں ملک بھر سے معروف نعت خواں شریک ہوئے۔
- ✦ ادبی تنظیم ''ہم کلام'' کے زیر اہتمام توقیر احمد شریفی کی سالگرہ کا اہتمام لاہور میں کیا گیا۔
- ✦ جم خانہ کلب لاہور میں محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں نامور شعرا و شاعرات نے شرکت کی۔
- ✦ عالمی ادب اکادمی کے زیر اہتمام فیض الاسلام ہال راولپنڈی میں کل پاکستان محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔
- ✦ بزمِ عالم پاکستان لاہور کے زیر اہتمام خواتین کے عالمی دن کے حوالے سے محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔
- ✦ اثبات انٹرنیشنل کے زیر اہتمام ادبی کانفرنس کا اہتمام لاہور میں کیا گیا۔

فروغِ ادب کے لیے وقف
بہ یاد: سید قاسم محمود
بک ڈائجسٹ
bookdigest@hotmail.com
ISSN 2079-4584
مدیر اعلا: مظہر سلیم مجوکہ
mazharmajoka@yahoo.com
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ
azharmajoka@yahoo.com
برائے خط و کتابت و ترسیلِ زر
بک ڈائجسٹ
کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ 0333-4377794

نامہ ہائے احباب

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

سلام مسنون! جنوری ۲۰۱۸ء کا ماہنامہ ارژنگ نظر نواز ہوا۔ آپ اور عامر بن علی مستقل مزاجی سے اس رسالے کو تازگی اور توانائی سے ہمکنار کر رہے ہیں۔ ۲۰۱۷ء کا سال اس کی زندہ مثال ہے۔ پچھلے سال کے ارژنگ کے شمارے شعر و ادب کی ایک خوبصورت دنیا اپنے اندر سمیٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں آپ کی محنت اور جانفشانی کی داد دیتا ہوں۔ آپ لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اُمید ہے ماہنامہ ارژنگ کے لیے نیا سال بھی خوبصورت تخلیقات کے حوالے سے مبارک ہوگا۔ جنوری ۲۰۱۸ء کا ارژنگ بھی اپنے اندر ایک جہانِ معنی سموئے ہوئے جلوہ گر ہوا ہے۔ حمد و نعت کے ہمراہ دیگر اصناف سخن اور خوبصورت افسانے ہر چیز اپنی جگہ لائق تحسین ہے۔ آپ کی ادارت میں ماہنامہ ''ارژنگ'' ترقی کی منازل نہایت تیزی سے طے کر رہا ہے۔

عزیم غلام اصغر طاہر ایک اُبھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ اُن کی طرف سے ایک حمد اشاعت کے لیے ارسال ہے۔ اپنی تازہ رباعیات بھی ارژنگ میں اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ پسند فرمائیں گے۔ اُمید ہے آپ مع عزیزان بخیریت ہوں گے۔

مظفر حسن منصور/خوشاب

جناب حسن عباسی صاحب

سلام مسنون! بہت دیر کے بعد حاضری دے رہا ہوں۔ ارژنگ مل رہا ہے۔ آپ کی ادارت میں اس کا حسن دن بدن نکھرتا جا رہا ہے۔ اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا:

بہت محال ہے اس کے خیال تک پہنچوں
وہ لفظ لفظ میں سو معجزے دکھاتا ہے

ساندل کالج فیصل آباد کے مشاعرے کو میری بھانجی رضوانہ رشید نے کنڈکٹ کیا تھا۔ میں بھی Invited تھا لیکن بوجوہ نہ پہنچ سکا۔ میرا سلام بہرحال آپ کو مل گیا ہوگا۔ کیونکہ رضوانہ کے ذریعے آپ کا سلام مجھے موصول ہوگیا ہے۔

آخر میں میرا اور مسعود احمد کا پرخلوص سلام!

دعا گو

احمد جلیل/ اوکاڑہ

جناب حسن عباسی صاحب!

آداب! اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

''ارژنگ'' اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ وصول ہوتا ہے۔ شکریہ آپ یاد رکھتے ہیں۔

عمدہ لکھنے والوں کا ایک خوبصورت جھرمٹ ہے۔ ارژنگ میں انٹرویو کا سلسلہ تو بہت عمدہ ہے۔ افسانے، شاعری، تبصرے، تجزیے، سبھی عمدہ اور شاندار۔

فیس بک پر ایک نئی کتاب کے بارے پڑھا آپ کو بہت مبارک ہو۔ اُمید ہے پڑھنے کو ملے گی۔ اس لیے کہ آج کی نوجوان نسل کے شعرا میں آپ کا نیا مقام ہے۔ عامر بن علی کو بھی میرا سلام عرض۔ سلامت رہیے۔

آسناتھ کنول/ لاہور

برادرم حسن عباسی!

اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ نومبر کا ارژنگ مل گیا ہے۔ حرف حرف ادب تصویر ہو رہا ہے جس کے لیے اہل علم و ادب کو آپ کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر اخلاق اور تفاخر محمود گوندل کی حمد و نعت کے اپنے اطوار ہیں۔ مضامین کا حصہ بہت جاندار ہے۔ دلاور علی آذر کی غزل پر قیصر مسعود نے عمدگی سے مضمون لکھا ہے۔ دلاور علی آذر کا شمار تازہ کار شعرا میں ہوتا ہے۔

افسانوں میں انیلہ بھلر کا افسانہ مائی جانن اچھا افسانہ ہے۔ اس افسانے سے انیلہ بھلر کے افسانوی خصائص کھل کر سامنے آرہے ہیں۔

شعری گوشوں میں لطیف ساحل، ارشد نذیر ساحل، سعدیہ سیٹھی، ظفر اعوان، عدیل احمد آسی اور طاہر عدیل طاہر کی غزلیات دل و نگاہ کو طراوت بخش رہی ہیں۔

سلیمان عبداللہ اور عامر بن علی کے سفرنامے بار بار پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ دونوں صاحبان سفرنامے کے باب میں خلاق اور مشاق ہیں۔ حسن عباسی کا سفرنامہ یورپ میں چند روز بھی خاصے کی چیز ہے۔ میرے شفیق اور کریم دوست کامی شاہ کی دونوں غزلوں سے تازہ مضامین کے دروازے کھل رہے ہیں۔ کامی شاہ کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ جدید اُردو غزل میں ان کا نام اعتبار اور اہمیت کا حامل ہے۔ حصہ غزل و نظم خوب ہے۔

کچھ تخلیقات ارسال کر رہا ہوں دیکھ لیجیے۔

اسد عباس خان/ جھنگ

راجا نیرّ

قارئین۔ موجودہ شمارے کا سرِ ورق اردو پنجابی کے معروف شاعر' مصوّر اور کالم نویس راجا نیرّ کی ہنروری کا اعجاز ہے۔ شاعری اور مصوّری کے ساتھ ساتھ انہوں نے صحافت اور مضمون نگاری کے میدان میں بھی اپنا رنگ جمایا۔ ادبی کتب' رسائل اور جرائد کے تقریباً 300 سے زائد سرِ ورق ان کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ روزنامہ ''امسال'' ''عزم'' ''ناگ منی'' اور الشرق انٹرنیشنل میں ادبی ایڈیشن کے حوالے سے الگ پہچان رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایف ایم 95 کے لیے براڈ کاسٹنگ اور اپنا ٹی وی کے لیے ادبی پروگرام کر رہے ہیں۔ ادارہ ارژنگ ادب اور فنونِ لطیفہ کے دیگر شعبوں میں راجا نیر کی خدمات کو سہراتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہے۔ مدیر

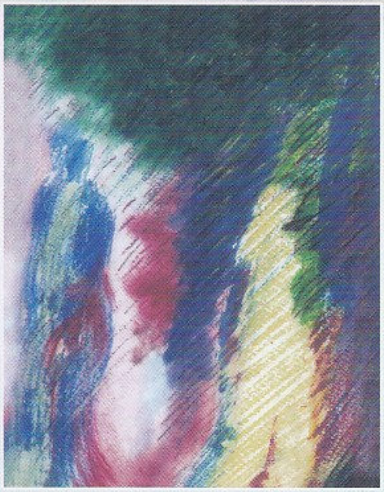

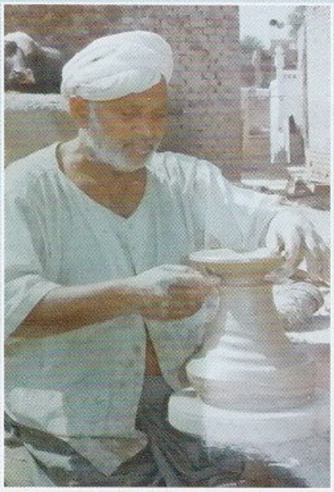

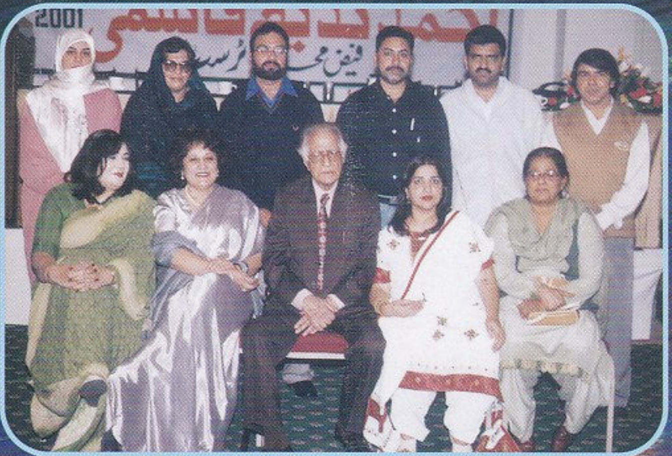

(بیٹھے ہوئے) سلمیٰ اعوان، منصورہ احمد، احمد ندیم قاسمی، نیلم احمد بشیر، فرحت پروین
(کھڑے ہوئے) راجا نیرّ، عمران نقوی، اُلفت بخاری، مسعود عثمانی، ناہید قاسمی
(تقریب احمد ندیم قاسمی ایوارڈ 2001ء لاہور)

یادش بخیر
راجا نیرّ، قمر رضا شہزاد، حفیظ تائب
کل پاکستان نعتیہ مشاعرہ ساہیوال 1987ء

لاہور رائیٹرز کلب کے زیرِ اہتمام جمخانہ کلب میں

ایک شام عامر بن علی کے نام

صدارت : امجد اسلام امجدؔ

مہمانان خصوصی : مجیب الرحمان شامی • شعیب بن عزیز • سہیل وڑائچ

میزبان : ناز بٹ • قمر رضا شہزاد • وسیم عباس

امجد اسلام امجد، ناز بٹ، حمیدہ شاہین، عامر بن علی، سیما تیروز، شعیب بن عزیز، اسلم ڈوگر، محمد دلاور چودھری، جبار واصف، نیلم احمد بشیر، قمر رضا شہزاد، فاروق عالم انصاری
مصطفیٰ کمال پاشا، محمد ناصر اقبال خان، محمد آصف عنایت بٹ، عتیق الرحمٰن صفی، سلمان طارق بٹ، وسیم عباس شریک ہیں۔

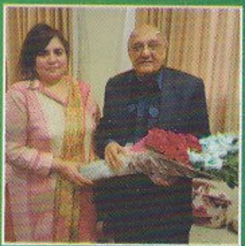

Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com